فہرست

شذرات	سانحۂ نیویارک	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۱۷۸-۱۷۹)	جاوید احمد غامدی	۱۳
معارفِ نبوی	تقدیر اور عمل	طالب محسن	۱۷
دین و دانش	قانون معاشرت (۲)	جاوید احمد غامدی	۲۳
نقطۂ نظر	فقہ اسلامی میں غیر منصوص مسائل کا حل (۲)	محمد عمار خان ناصر	۳۱
	اسبال ازار (۱)	محمد صدیق شاہ بخاری	۴۱
حالات و وقائع	اسلام اور مغرب ـــــ ۱۱ ستمبر کے بعد	خورشید احمد ندیم	۴۹
	صلح حدیبیہ اور جہاد و قتال	محمد بلال	۵۴
یسئلون	جہاد اور دہشت گردی	افضال ریحان / جاوید احمد غامدی	۵۹
	''ندائے ملت'' کے استفسارات	قربان انجم / جاوید احمد غامدی	۶۶
ادبیات	خیال و خامہ (۲)	جاوید احمد غامدی	۷۰

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سانحۂ نیویارک

۱۱ ستمبر کو امریکا کے شہر نیویارک میں ہزاروں انسانوں کو اجتماعی طور پر قتل کر دیا گیا۔ چشمِ فلک نے ایسے منظر پہلے بھی بارہا دیکھے ہیں، مگر یہ حادثہ شاید اس لیے منفرد ہے کہ یہ عین اس زمانے میں رونما ہوا ہے جب تہذیبِ انسانی اپنی ترقی کی آخری منزلوں کو چھو رہی ہے، جب ملکوں کی حدیں معدوم ہو رہی ہیں اور فرزندانِ آدم مل کر ایک عالمی برادری تشکیل دے رہے ہیں اور جب پروردگارِ عالم کا یہ فرمان کہ: جس نے کسی انسان کو قتل کیا، اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا، دنیا کے علم و فکر، فلسفہ و حکمت اور قانون و اخلاق میں اساسی اصول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا وجودِ اجتماعی یہ ماننے ہی کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس قتل کے خون آشام مجرم اسی نوع سے تعلق رکھتے ہیں جسے خالقِ حقیقی نے انسان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کی چشمِ حیراں مجسم سوال ہے کہ یہ قاتل:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انساں ہیں کہ صحرا میں شبِ تار کی وحشت
آدم ہیں کہ ابلیس کے چہرے کی سیاہی

الہامی قانون میں ایسی دہشت و بربریت عالم کے پروردگار اور اس کے فرستادوں کے خلاف اعلانِ جنگ اور اقلیمِ خداوندی میں فتنہ و فساد کے مترادف ہے۔ اس کی رو سے ''محاربہ'' اور ''فساد فی الارض'' کے ان مجرموں کے لیے دنیوی سزا عبرت ناک طریقے سے قتل اور اخروی انجام جہنم کا عذابِ عظیم ہے:

> ''وہ لوگ جو اللہ اور رسول سے لڑتے اور ملک میں فساد برپا کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں، اُن کی سزا بس یہ ہے کہ عبرت ناک طریقے سے قتل کیے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا اُن کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔ یہ اُن کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لیے بڑی سزا ہے۔'' (المائدہ ۵: ۳۳۔ ۳۴)

۱۱ ستمبر کا سانحہ بہت بڑا ہے، مگر اس کے بعد اس سے بھی بڑا سانحہ یہ رونما ہوا ہے کہ اس قتل و غارت کے ملزم وہ لوگ قرار پائے ہیں جو تاریخ انسانی میں امن و سلامتی کے سب سے بڑے علم بردار کے پیرو ہیں۔ جس کا یہ اعلان آج بھی

میدان عرفات میں گونج رہا ہے کہ:

''لوگو، تمھارا رب بھی ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک ہے۔ اور تمھارا خون اور تمھارا مال قیامت تک اسی طرح حرام ہے، جس طرح حج کا یہ دن، ذوالحج کا یہ مہینا اور ام القریٰ کا یہ شہر حرام ہے۔''

محمدِ عربی کے پیرووں سے اس ظلم کا تصور بھی محال ہے، لیکن اگر یہ الزام عدل کے ایوانوں میں ثابت ہو جاتا ہے تو پھر اسلام اور اہلِ اسلام ان کی ذات، ان کے نظریات اور ان کے اقدامات سے برأت کا اعلان کرتے ہیں۔

امریکا نے اس دہشت گردی کو اپنی قوم اور پوری انسانیت کے خلاف اقدامِ جنگ سے تعبیر کیا ہے اور اس کے ذمہ داروں اور ان کے معاونین کے خلاف جنگ کا باقاعدہ آغاز کر دیا ہے۔ اس کارروائی سے پہلے اس نے افغانستان میں موجود عرب مسلمان اسامہ بن لادن پر دہشت گردی کا الزام عائد کیا اور طالبان سے یہ مطالبہ کیا کہ اسے بلاتاخیر امریکا کے حوالے کیا جائے۔ طالبان حکومت نے اس الزام کا انکار کرتے ہوئے شواہد پیش کرنے پر اصرار کیا۔ امریکا نے اپنی تحقیقات طالبان کے سامنے تو پیش نہیں کیں، البتہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل اور طالبان کی معتمد اور حلیف ریاست پاکستان کو ان سے آگاہ کیا اور بڑی حد تک ان کا اطمینان اور اعتماد حاصل ہو جانے کے بعد ہی افغانستان پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس دوران میں امریکی حکومت نے پاکستان سے تعاون کا بھی مطالبہ کیا۔ اس کے جواب میں ہماری حکومت نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا ہے۔

جنگی کارروائی شروع ہو جانے کے بعد اس کے اثرات اگرچہ عالم گیر ہیں، مگر عملی تناظر میں تین اقوام اس صورتِ حال میں براہِ راست شریک ہیں:

۱۔ امریکا

۲۔ افغانستان

۳۔ پاکستان

ہم یہاں ان تینوں قوموں کے طرزِ عمل کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کریں گے۔

امریکا

امریکا نے دہشت گردی کا شکار ہونے کے بعد یہ موقف اختیار کیا تھا کہ:

- امریکا کی جنگ دہشت گردی کے خلاف ہے اور دنیا سے دہشت گرد گروہوں کے خاتمے تک یہ جنگ جاری رہے گی۔
- اس مقصد کے حصول کے لیے ہر راستہ اختیار کیا جائے گا۔
- یہ کوئی مذہبی جنگ نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

○ اس ضمن میں امریکا کی اولین ترجیح حالیہ دہشت گردی کے مجرم اسامہ بن لادن اوراس کی تنظیم ''القاعدہ'' پر قابو پانا ہے۔

○ اسامہ کو طالبان حکومت نے پناہ دے رکھی ہے۔ طالبان کی حکومت نہ صرف افغان عوام پر ظلم ڈھا رہی ہے، بلکہ دہشت گردوں کو پناہ دے کر اوران کی کارروائیوں کی حمایت کر کے ہر جگہ لوگوں کے لیے خطرات کا سامان پیدا کر رہی ہے۔

○ طالبان سے ہمارا مطالبہ ہے کہ:

۱۔افغانستان میں موجود اسامہ بن لادن اوراس کی تنظیم کے تمام رہنماؤں کو امریکا کے حوالے کر دیں۔

۲۔کابل میں عیسائیت کی تبلیغ اور دوسرے جرائم میں گرفتار غیر ملکیوں کو باعزت رہا کر دیں۔

۳۔افغانستان میں دہشت گردی کے تمام تربیتی مراکز بند کر دیں اور دہشت گردوں اوران کے معاونین کو امریکا کے سپرد کر دیں۔

۴۔امریکا کو افغانستان کے اندر مکمل رسائی کی سہولت فراہم کریں تا کہ اس بات کا جائزہ لیا جا سکے کہ دہشت گردی کے مراکز فی الواقع ختم ہو گئے ہیں۔

ان مطالبات کو سامنے لانے کے بعد امریکا نے افغانستان کو یہ دھمکی دی کہ اگر مطالبات پورے نہ کیے گئے تو افغانستان پر فوج کشی کر دی جائے گی۔ مطالبات پورے نہ ہوئے اور بالآخر ۷ اکتوبر کو فوجی کارروائی شروع ہو گئی۔

ہمارے نزدیک جہاں تک امریکا کے اس اصولی موقف کا تعلق ہے کہ دنیا سے دہشت گردی کے خاتمے کے لیے سرگرم عمل ہونا چاہیے تو یہ بالکل درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دہشت گردی کی لہر پوری دنیا میں جس تیزی سے پھیل رہی ہے، اس کی بیخ کنی ضروری ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جو دہشت گردوں کی کارروائیوں سے محفوظ ہو۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر شخص خوف کا شکار ہے۔ گلیوں بازاروں میں اندھی گولیوں کا خوف ہے، ویرانوں میں لوٹ کھسوٹ اور اغوا کا خوف ہے، آبادیوں، اجتماع گاہوں اور ذرائع رسل و رسائل میں بم دھماکوں کا خوف ہے۔ اس خوف و دہشت کو پیدا کرنے والے کسی مذہب، کسی قوم یا کسی ملک کے دشمن نہیں ہیں، بلکہ پوری انسانیت کے دشمن ہیں۔ ان کے خلاف جنگ انسانیت کی بقا کی جنگ ہے۔ انسانیت کا کوئی وفادار اس جنگ میں تعاون سے گریز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہر فرد اور ہر قوم کو اس جنگ میں حصہ لینا چاہیے اور دہشت گردی کی بیخ کنی کے لیے ماضی کی تلخیاں، حال کے اختلاف اور مستقبل کے اندیشے نظر انداز کر کے ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے۔

امریکی موقف کی اصولی صحت کے باوجود یہ سوال ابھی تک حل طلب ہیں کہ کیا یہ لازم ہو گیا تھا کہ دہشت گردوں کے خلاف جنگ میدانِ جنگ ہی میں لڑی جائے؟ کیا ۲۵ دن اتنا وقت ہے کہ قوموں کے مابین معاملات کو اس کے دوران میں طے کیا جا سکے؟ کیا افغان حکومت نے مذاکرات کے دروازے ہر لحاظ سے بند کر دیے تھے؟ اور کیا مقررہ تاریخ کا کوئی الٹی میٹم

دے کر کارروائی کی گئی؟ یہ اور اس طرح کے بعض دوسرے سوال ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں اور یہ شبہ پیدا کر رہے ہیں کہ کہیں اس کارروائی کے پیچھے انتقامی جذبہ تو کارفرما نہیں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جنگ ہر حال میں ضرر رساں ہوتی ہے۔ اس کی نوبت اسی صورت میں آنی چاہیے جب بات چیت کا ہر دروازہ بند ہو جائے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک جس طرح نیو یارک میں ہونے والی دہشت گردی قابل مذمت ہے، اسی طرح امریکا کا افغانستان پر حملہ بھی قابل مذمت ہے، یہاں تک کہ امریکا کی جانب سے اس کا کوئی معقول عذر سامنے آ جائے۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ امریکا نے جنگی کارروائی شروع کر دی ہے، اس کے اخلاقی جواز پر تو بحث ہوتی رہے گی، مگر اس وقت سب سے بڑھ کر ضرورت اس امر کی ہے کہ امریکا کو اس بات پر آمادہ رکھا جائے کہ وہ فوجی کارروائی کو محدود تر رکھے اور اسے مکمل کر لینے کے بعد افغانستان میں امن وامان بحال کر کے رخصت ہو۔ اس ضمن میں جنرل پرویز مشرف صاحب کی طرف سے بیان کی گئی یہ اساسات نہایت صائب ہیں، اقوام عالم کو انھی پر اصرار کرنا چاہیے:

۱۔ فوجی اقدام افغانستان کے عوام کے خلاف نہ ہو اور یہ بہت مختصر وقت کے لیے ہو۔

۲۔ فوجی اقدام کے بعد افغانستان میں ایسی وسیع البنیاد حکومت قائم کی جائے جس میں مختلف طبقات کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے ہو۔

۳۔ افغانستان کی نئی حکومت کا رویہ پاکستان کے ساتھ دوستانہ ہو۔

۴۔ فوجی اقدام کے بعد افغانستان کی آبادکاری تیزی سے مکمل کی جائے۔

اس تناظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ امریکا کو ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے اور ان امور کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے:

۱۔ امریکا پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ تقویمِ خداوندی میں قوموں کے استمرارِ اقتدار کا انحصار مادی وسائل سے زیادہ اخلاقی اقدار پر ہوتا ہے اور انسان کے اجتماعی وجود کے لیے سب سے بڑی اخلاقی قدر عدل وقسط ہے۔ امریکا اگر دنیا پر اپنے اقتدار کا دوام چاہتا ہے تو اسے اپنے ہر عمل اور ردِ عمل کی اساس پروردگارِ عالم کے ان فرامین کو بنانا ہوگا:

> ''اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے ہٹا دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، بوجہ اس کے کہ انھوں نے روزِ حساب کو بھلائے رکھا۔'' (ص ۳۸: ۲۶)

> ''ایمان والو، عدل پر قائم رہنے والے بنو۔ اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس طرح نہ ابھارے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔'' (المائدہ ۵: ۸)

> ''تم اپنے بھائیوں کے مقدموں کو سننا، پر خواہ بھائی بھائی کا معاملہ ہو یا پردیسی کا، تم ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ

کرنا۔ تمھارے فیصلے میں کسی کی رو رعایت نہ ہو۔ جیسے بڑے آدمی کی بات سنو گے، ویسے ہی چھوٹے کی سننا۔'' (استثنا ۱:۱۶۔۱۷)

عدل کا ایک پہلو ظلم و بے انصافی کا خاتمہ اور دوسرا پہلو حق و انصاف کا احیا ہے۔ امریکا کو اپنی کارروائی کرتے ہوئے عدل کے ان دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ جہاں اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسانیت کے ان مجرموں پر قابو پانے کے لیے مذاکرات سے لے کر جنگی کارروائی تک ہر طریقہ اختیار کیا جائے، مجرموں کی پشت پناہی اور سرپرستی کرنے والوں کو بھی مجرم تصور کرتے ہوئے ان پر بھی گرفت کی جائے اور انھیں عبرت ناک سزائیں دی جائیں، وہاں اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ فرد قرار دادِ جرم حقیقی ہو اور اضافی الزامات سے پاک ہو، تحقیقی عمل اس قدر شفاف ہو کہ اس پر بڑے سے بڑا ناقد بھی انگلی نہ اٹھا سکے اور کارروائی کا دائرہ ہر حال میں مجرموں تک محدود رکھا جائے۔

۲۔ امریکا کو مغرب اور غیرِ مغرب میں موجود ان عناصر کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے جو دہشت گردی کے خلاف اس جنگ کو اسلام اور مغرب کی جنگ کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اس کے اربابِ حل و عقد کو اس موقع پر نہایت حکمت و دانش کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں اسے دو پہلوؤں سے اپنے طرزِ عمل اور اقدامات کو مزید موثر کرنا ہوگا:

ایک یہ کہ وہ اپنے بیانات اور اپنی فہرستِ اہداف میں ان غیر مسلم تنظیموں کو بھی نمایاں کرے جو دہشت گردی کے حوالے سے مسلمہ طور پر معروف ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ اس معاملے کو سیاسی رنگ آمیزی سے پاک رکھے اور امریکا سے اختلاف رکھنے والے عراق، ایران اور لیبیا جیسے مسلمان ملکوں پر تاخت کرنے سے گریز کرے تاکہ یہ صورت حال مسلمانوں اور مغرب کی جنگ میں تبدیل نہ ہو جائے۔ اس موقع پر وہ محض اس اطمینان کو کافی نہ سمجھے کہ مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کی اکثریت ان کی حلیف ہے، اسے اس امرِ واقعی کو بھی اہمیت دینی چاہیے کہ دنیا بھر کے مسلمان عوام کی اکثریت اس کی پالیسیوں کو مفاد پرستی اور بے انصافی پر مبنی سمجھتی ہے۔

۳۔ اس موقعے پر امریکا کو تمام جذبات اور تعصّبات کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس پر غور کرنا چاہیے کہ کہیں یہ حادثہ اس کے اپنے اقدامات اور پالیسیوں کا ردِ عمل تو نہیں ہے۔ ہیروشیما، ناگاساکی اور ویت نام میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون اس کی گردن پر تصور کیا جاتا ہے، فلسطین اور کشمیر میں جبرِ مسلسل کو اس کی پالیسیوں سے منسوب کیا جاتا ہے، ترقی پزیر ممالک میں حکومتوں کے عدمِ استحکام کو اسی سے وابستہ قرار دیا جاتا ہے، اقوام کی باہمی آویزش کو اسی کے اقدامات کا نتیجہ کہا جاتا ہے اور دنیا میں پائی جانے والی غربت و افلاس کو اسی کے نظامِ سرمایہ داری کی دین سمجھا جاتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ پوری دنیا کے عوام کی اکثریت میں اس کا تعارف ایک ظالم حکمران، ایک غیر عادل قاضی، ایک غاصب سرپرست اور ایک مفاد پرست دوست کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ امریکا اگر دنیا میں فی الواقع کوئی کردار ادا کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے اس تعارف کو تبدیل کرنا ہوگا اور ان آوازوں کی طرف متوجہ ہونا ہوگا جو اب اس کے اپنے وجود سے بھی اٹھنے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر امریکی جریدے ''زیڈ'' کے مدیر مائیکل البرٹ لکھتے ہیں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

’’تیسری دنیا کے عوام کی تقدیر اور ان کا مستقبل غیر ملکی حکمرانوں کے پاس ہمیشہ سے یرغمال چلا آرہا ہے۔ لہٰذا ہم جو خود کو انتہائی ترقی یافتہ قوم تصور کرتے ہیں، اس حقیقت کو محسوس نہیں کر سکتے کہ لاکھوں افراد محض اس لیے فاقہ کشی پر مجبور ہیں کہ ان کے غریب ملک کی تمام تر توانائیاں ملٹی نیشنل سرمایہ کو منافع فراہم کرنے کی غرض سے صرف کی جا رہی ہیں۔ یہ بھی تو قتلِ عام ہی کی ایک صورت ہے۔ ہاں یہ بھی قتل ہے جس کے نتیجے میں تیسری دنیا کے ممالک مکمل طور پر اپنے غیر ملکی آقاؤں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ چنانچہ یہ اشد ضروری ہے کہ دہشت گردی کی مذمت کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ تجارت کی بھی اسی شدت کے ساتھ مذمت کی جائے۔‘‘ (بحوالہ روزنامہ جنگ، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۱)

امریکی دانش ور نوم چومسکی کا کہنا ہے:

’’اس نوعیت کے جرائم ان لوگوں کے لیے سوچنے اور غور و فکر کرنے کا ایک سنہری موقع فراہم کرتے ہیں جن کا خیال ہے کہ طاقت اور قوت کے استعمال سے ہر چیز ممکن ہو سکتی ہے۔‘‘ (بحوالہ روزنامہ جنگ، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۱)

رابرٹ فسک نے بیان کیا ہے:

’’اگر کسی عرب سے (۱۱ ستمبر کو ہونے والی) ان بیس یا تیس ہزار ہلاکتوں کے بارے میں دریافت کریں تو چاہے وہ مرد ہو یا خاتون، اسے ایک شدید جرم قرار دے گا۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ ضرور پوچھے گا کہ ہم سے ان پابندیوں کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا جا رہا جن کے نتیجے میں تقریباً پانچ لاکھ عراقی بچے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے؟ ہم اس بات پر اپنی شدید خفگی کا اظہار کیوں نہ کریں کہ ۱۹۸۲ میں لبنان پر اسرائیلی حملے میں ۱۷۵۰۰ شہری ہلاک ہو گئے؟ مشرقِ وسطیٰ میں اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرار دادوں کو نظر انداز کرنے پر ایک قوم کے خلاف تو کچھ نہیں کہا گیا، مگر دوسروں کے ایسا کرنے پر فوراً پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ان بنیادی وجوہات ہی کے نتیجے میں مشرقِ وسطیٰ میں گزشتہ ستمبر میں آگ بھڑکتی رہی۔ عربوں کی زمین پر اسرائیلیوں کا قبضہ، فلسطینیوں کی بے دخلی، بم باری، ہلاکتیں، تشدد، ان تمام عوامل کو گزشتہ روز کی وحشیانہ کارروائی کا ایک ہلکے سے ہلکا سبب سمجھا جا سکتا ہے۔ چلیے ہم اسرائیل کو دوش نہیں دیتے۔ ہم اس بات کا بھی یقین کر لیتے ہیں کہ صدام حسین اور اسی قماش کے چند دیگر لوگ اس واقعے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، مگر اس معاملے میں تاریخ ہم پر بھی ذمہ داری عائد کرتی ہے اور ہمارا تاریک رخ بھی اس کا یقینی طور پر ایک کردار ہے۔ ہمارے جھوٹے وعدوں اور شاید سلطنتِ عثمانیہ کی تباہی نے بھی اس المیے کی راہ ہموار کی۔‘‘ (بحوالہ روزنامہ جنگ، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۱)

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

افغانستان

امریکا کے مطالبات کے جواب میں افغانستان کی طالبان حکومت نے جو موقف اختیار کیا ہے، اس کے بنیادی نکات یہ ہیں:

- ہم امریکا میں ہونے والی دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں۔
- اسامہ بن لادن ہمارے مہمان ہیں، انھیں ہم امریکا کے حوالے نہیں کر سکتے۔
- امریکا نے اگر ہم پر جنگ مسلط کی تو ہم اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔

افغانستان کے اس موقف کو ممکن ہے کہ بعض لوگ حریت و خودداری سے تعبیر کریں، مگر ہم سمجھتے ہیں کہ بعض آدرش ان سے بھی مقدم ہیں اور جن کی تقدیم پر اسلام اور انسانیت کے ضمیرِ اجتماعی کو اصرار ہے۔ افغانستان کے لیے موجودہ تناظر میں حسب ذیل معیارات کی اہمیت بہت بنیادی ہے:

۱۔ افغانیوں کی مخصوص تہذیبی روایات کے پس منظر اور بیرونی تاخت اور اندرونی خلفشار کی وجہ سے اس خطۂ ارض میں اگرچہ انسانی جان بہت ارزاں ہو گئی ہے، مگر نوشتۂ خداوندی میں ایک انسانی جان کی قیمت پوری نوعِ انسانی کی قیمت کے برابر ہے۔ چنانچہ اس امر کی ناگزیر ضرورت ہے کہ افغان قوم اس معاشرے کی تشکیل میں سرگرمِ عمل ہو جائے جس میں جنگ و جدال کے بجائے امن و سلامتی کی دعوت ہو، جہاں اقتدار کے بجائے انسانی خون قیمتی ہو اور جہاں اجتماعی فیصلے گولا بارود کے بجائے رائے عامہ کی بنیاد پر ہوں۔ ایسے ہی معاشرے کو حقیقی معنوں میں اسلامی قرار دیا جا سکتا اور ایسا ہی معاشرہ دنیا کی اخلاقی ترقی میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔

۲۔ فرد ہو یا قوم، دنیا میں اس کے شرف و وقار کا معیار علوِانانیت نہیں، بلکہ بلندیِ کردار ہوتا ہے۔ کسی صاحبِ عزت پر اگر کوئی الزام لگ جائے اور وہ اسے ہر لحاظ سے غلط سمجھتا ہو تو اس کے شایانِ شان یہی ہے کہ وہ اس کے ثبوت طلب کرنے کے بجائے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کر دے اور اپنے رب سے یہ توقع رکھے کہ وہ اسے کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ سانحۂ نیویارک کے بعد افغانستان پر یہ الزام لگ گیا تھا کہ اس کی سرزمین کو دہشت گردوں نے اپنا مستقر بنا رکھا ہے اور وہ وہاں سے تربیت پا کر دنیا میں فساد اور تباہی برپا کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ اس شک میں اس کے دشمن ہی نہیں، بلکہ دوست بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے بعد اس کے وقار کا تقاضا یہی تھا کہ وہ تحقیق و تفتیش کے لیے اپنے دروازے پوری طرح کھول دے۔ اس کا دامن اگر بے داغ ہے تو ساری دنیا کی اخلاقی قوت اس کے ساتھ آ جائے گی۔ یہی رویہ اسامہ بن لادن کو اختیار کرنا چاہیے تھا۔ اس اقدام کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ دنیا میں یہ پراپیگنڈا باقی نہ رہے کہ اسلام اور دہشت گردی لازم و ملزوم ہیں۔

۳۔ حکمت و دانش اور سیاسی مصالح کے پہلو سے طالبان کا مطالبات ماننے سے انکار کرنا اور اس کے نتیجے میں اپنی قوم کو جنگ کے لیے پیش کر دینا ناقابلِ فہم ہے۔ اس وقت اس کی اندرونی صورتِ حال یہ ہے کہ اس کا اقتدار پورے ملک پر قائم ہی نہیں ہے، کئی علاقے دوسری تنظیموں کی قبضے میں ہیں اور وہ اس کے خلاف مسلسل سرگرمِ جنگ ہیں۔ ملک میں کوئی مستحکم نظام کارفرما نہیں۔ بیرونی لحاظ سے دیکھا جائے تو طالبان حکومت کو دنیا کے صرف تین ممالک پاکستان، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب نے تسلیم کیا تھا اور اب وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ اس اندرونی خلفشار اور خارجی تنہائی کے بعد عقل مندی کا کم سے کم تقاضا یہ تھا کہ امریکا جیسی عالمی طاقت کے ساتھ تصادم سے ہر حال میں بچا جاتا اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جاتا جو اقوامِ عالم کے عمومی منشا کے خلاف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر طالبان قیادت نے اپنے موقف میں اتنی لچک بھی پیدا نہیں کی کہ وہ دنیا کی محض ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

قومی مفاد کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو طالبان حکومت نے سمجھ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ اسے اس بات کو باور کرنا چاہیے تھا کہ اس وقت اس کا سب سے بڑا مسئلہ قومی تعمیر ہے۔ اس کے عوام اس وقت اپنی تاریخ کی بدترین غربت سے دوچار ہیں۔ مسلسل جنگوں نے خوددار افغانوں کے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی تھما دیا ہے۔ لاکھوں افغان اپنے ہمسایہ ملکوں کی سرحدوں پر بے یارومددگار پڑے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ امریکی مطالبات کو ماننے سے انکار کرکے افغانیوں نے اپنی عزت و ناموس اور خودداری کا بھرپور اظہار کیا ہے، مگر معلوم نہیں کہ یہ خودداری اس وقت کہاں چلی جاتی ہے جب ان کے خوب رو بچے، پردہ دار عورتیں اور ضعیف بزرگ چند نوالوں کے لیے غیر ملکیوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہوتے ہیں؟ جنگوں کا یہ تسلسل اگر اسی طرح قائم رہا تو خدانخواستہ ان کی عظیم خودداری ان کے وجود ہی سے محو ہو سکتی ہے۔

پاکستان

حادثے کے فوراً بعد امریکا نے افغانستان کو اپنی تاخت کا اولین ہدف قرار دے کر حکومتِ پاکستان سے فوجی کارروائی میں عملی تعاون کا مطالبہ کیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے یہ تقاضا کیا تھا کہ پاکستانی حکومت اسے:

۱۔ دہشت گردوں کے بارے میں انٹیلی جنس سے متعلق معلومات فراہم کرے۔

۲۔ جنگی کارروائی کے لیے فضائی حدود کے استعمال کی اجازت دے۔

۳۔ اپنی سرزمین پر فوجی اڈے فراہم کرے۔

پاکستان نے امریکا کے ان مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ جنرل پرویز مشرف صاحب نے اس موقع پر قوم کو اعتماد میں لینے کے لیے حسبِ ذیل چار قومی ترجیحات کا تعین کیا اور امریکا سے تعاون نہ کرنے کی صورت میں ان کے مجروح ہونے کا تاثر دیا:

۱۔ غیر ملکی خطرے سے ملک کی حفاظت۔

۲۔ معیشت کی بحالی۔

۳۔ سٹریٹجک اثاثوں کی حفاظت۔

۴۔ مسئلۂ کشمیر کا حل۔

۷ اکتوبر کو افغانستان پر امریکی حملے کے بعد پاکستان نے حسبِ وعدہ اپنا اخلاقی اور عملی تعاون جاری رکھا ہے۔ پاکستانی عوام کی اکثریت نے اسے مجبوری قرار دیتے ہوئے اس اقدام کی تائید کی ہے، جبکہ مذہبی جماعتوں کی اکثریت نے اسے بزدلی قرار دیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی طرف سے امریکا کی حمایت کا اعلان دانش مندی پر مبنی ہے۔ پاکستان اس وقت اپنی بدحال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معیشت اور بھارت کے ساتھ تنازعات کی وجہ سے اگر چہ اس پوزیشن ہی میں نہیں ہے کہ امریکا جیسی قوت کی ناراضی کا خطرہ مول لے سکے، لیکن اگر وہ اس صورتِ حال میں نہ بھی ہوتا، تب بھی اسے دہشت گردی کے خاتمے کے لیے بھرپور تعاون کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ ملکی سالمیت کے پہلو سے بھی اور انسانیت کے تحفظ کے حوالے سے بھی حکومتِ پاکستان کا اقدام درست ہے۔

اس صورتِ حال میں حکومتِ پاکستان کو جو امور ملحوظ رکھنے چاہییں، وہ ہمارے نزدیک یہ ہیں:

۱۔ اپنے ہر فیصلے کی اساس عدل و انصاف کے مسلمات پر قائم کی جائے اور پروردگارِ عالم کی اس ہدایت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ:

''ایمان والو، انصاف پر قائم رہنے والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگر چہ اس کی زد خود تمھاری اپنی ذات، تمھارے والدین اور تمھارے اقربا ہی پر پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کے لیے احق ہے۔ اس لیے تم خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر اسے بگاڑو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔'' (النساء۴: ۱۳۵)

عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ افغانستان اگر ظالموں اور دہشت گردوں کا حامی ہے تو اس کا محض اس بنا پر ساتھ نہ دیا جائے کہ وہ ہم قوم اور ہمسایہ ملک ہے اور امریکا اگر حدود سے تجاوز کر کے ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرتا ہے تو صرف اس بنیاد پر اس کی تائید نہ کی جائے کہ وہ عالم کی مسند اقتدار پر فائز ہے اور اس سے ہمارے مفادات وابستہ ہیں۔ اس موقع پر تعاون اور عدمِ تعاون کی بنیاد مادی مفادات کے بجائے عدل و انصاف اور اخلاقی اقدار کی حفاظت ہونی چاہیے۔

۲۔ موجودہ صورتِ حال میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ دنیا کو اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ دنیا میں اسلام کا ہدف حصول اقتدار نہیں، بلکہ دعوت و اصلاح کے ذریعے سے دین و اخلاق کا فروغ ہے۔ اس کے ماننے والے اس دنیا کو ایک آزمایش گاہ تصور کرتے اور اہلِ دنیا کو حق کی تذکیر محض اس لیے کرتے ہیں کہ آخرت میں ان کی معذرت قبول ہو سکے اور وہ جہنم کے عذاب سے بچ سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقوامِ عالم کے سامنے اس بات پر بھی اصرار کیا جائے کہ اسلام کو ان چند مسلمانوں کے حوالے سے دیکھنا درست نہیں ہے جو اپنے فتنہ و فساد کو اسلام سے منسوب کرتے ہیں۔ اسلام کو اگر دیکھنا ہے تو اس کے صحیفۂ مقدس، اس کے پیغمبر کے اسوۂ حسنہ اور اس کے اولین نمائندوں کی خلافتِ راشدہ میں دیکھنا چاہیے۔

۳۔ دنیا پر اسلام کے غلبے کی تمنا رکھنے والے عام مسلمانوں کو حقیقت حال سے روشناس کرایا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ وہ اس وقت دنیا کی محکومِ محض قوم ہیں۔ دنیا پر تسلط و بالادستی تو بہت دور کی بات ہے، وہ اپنی ریاستوں کے اندر بھی حقیقی اقتدار سے محروم ہیں۔ مغرب کی تہذیب و تمدن، فکر و فلسفہ اور علم و فن ان کے مادی وجود کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ کو بھی مغلوب کر چکے ہیں۔ ان کے اہلِ دانش یورپ کی زبان بولتے اور اسی کی اقدار کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، ان کے حکمران

اسی کی قصیدہ خوانی کرتے اور کاسۂ گدائی لے کر اسی کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، ان کے ہنر منداسی کے فنون کی تفہیم کو اپنی تخلیق کی معراج تصور کرتے ہیں، ان کے عوام الناس اسی کی سرزمین کو جنت ارضی سمجھتے اور اس کے حصول کے لیے اپنا معاشرہ، اپنا وطن اور اپنا خاندان تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی حالت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مغرب پر غلبے کا نعرہ لگاتے ہیں تو اسے زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی عارضے ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اہلِ اسلام کی یہ حالت لائق صد افسوس ہے، مگر ماتم اس بات کا ہے کہ مسلمان قوم کو اس مرض میں مبتلا کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھیں منصبِ مسیحائی حاصل ہے۔ ان کی اس مسیحائی کا نظارہ مسجدوں کے منبروں اور مذہبی مجلسوں کے اسٹیجوں پر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں سے تباہ و برباد کر دو، جلا کر راکھ بنا دو اور جان سے مار ڈالو کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام کا ہدفِ اصلی دنیا پر غلبہ اور حکمرانی قائم کرنا ہے، اس لیے ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لیے پوری جدوجہد کرے۔ یہ مقدمہ اگرچہ بجائے خود سراسر غلط ہے، لیکن اگر اسے درست بھی مان لیا جائے تب بھی طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان علمبردارانِ انقلاب کا طرزِ عمل اپنے مقاصد ہی کے بالکل خلاف ہے۔ اس ہدف کی طرف بڑھنے کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف اپنے اخلاق و کردار کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اقوامِ عالم کی نظریں ان کی جانب اٹھنی شروع ہو جائیں اور دوسری طرف دورِ جدید کے اسلحے سے اپنے آپ کو لیس کیا جائے اور اس امرِ واقعی کا ادراک کر لیا جائے کہ دورِ حاضر کے اسلحہ تیر و تفنگ اور گولا بارود نہیں، بلکہ علم و ہنر، سائنس اور ٹیکنالوجی، میڈیا اور اقتصادی وسائل ہیں۔

ہماری مذہبی جماعتوں کے قائدین نے حکومتِ پاکستان کی طرف سے امریکا کی حمایت اور امریکا کے افغانستان پر حملے کے بعد جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے، اس کے بارے میں جو بات کم سے کم کہی جا سکتی ہے، وہ یہی ہے کہ یہ رویہ اسلام کے ان نمائندوں کے ہرگز شایانِ شان نہیں تھا۔ اسلام تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مصیبت کے موقع پر صبر و استقامت اور حکمت و دانش سے کام لیا جائے، بیرونی افتاد کی صورت میں قیادت کا ساتھ دیا جائے، اختلاف کی ضرورت ہو تو بہت شایستگی سے اس کا اظہار کیا جائے اور نہایت پر امن طریقے سے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں کا طرزِ عمل ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی ان اسلامی تعلیمات کے برعکس ظاہر ہوا ہے۔ دیکھیے، یہ چند بیانات ہی ان کے رویے کی عکاسی کر رہے ہیں:

> ''افغانستان پر حملہ پاکستان پر حملہ ہے۔ اگر ہماری حکومت نے افغانستان پر حملہ کے لیے غیر مسلموں کو اپنے کندھے پیش کیے تو ہم ایسی حکومت کو رہنے نہیں دیں گے۔ ہم اپنی فوج سے لڑنا نہیں چاہتے، لیکن اگر افغانستان پر حملے کے لیے غیر ملکی فوج کو اڈے دیے گئے تو ہم اس حکومت کو نہیں چھوڑیں گے۔'' ...... ''پاکستان کی فضائی اور زمینی خلاف ورزی ہوئی تو اس کے نتائج امریکا کے ساتھ خود حکمرانوں کے لیے بھی خطرناک ہوں گے۔ اگر امریکا نے غلطی کی تو ذلت اس کا بھی مقدر بنے گی۔

جب دشمن مقابلے پر اتر آئے تو پھر جہاد فرض بن جاتا ہے۔'' ......''پاکستان کی قوم طالبان کے ساتھ ہے، ہم پاکستان کی سرزمین پر امریکی فوجیوں کو قدم نہیں رکھنے دیں گے۔ ہم امریکیوں کا محاسبہ کریں گے اور پاکستان کی دھرتی کو امریکیوں کا قبرستان بنا دیں گے۔'' ......''ہم نے اپنے کارکنوں کو سرحد کا رخ کرنے کا حکم دے دیا ہے اور جہاد کے لیے رجسٹریشن شروع کر دی ہے۔ ہم نے کارکنوں کو کہا ہے کہ جو لوگ سرکاری ٹی وی پر آکر اسامہ کے خلاف باتیں کر رہے ہیں، ان کی فہرستیں بنائیں۔ ہم ان امریکی ایجنٹوں پر زمین تنگ کر دیں گے۔ یہ امریکی ایجنٹ اپنے کفن ساتھ رکھیں، ہم انھیں معاف نہیں کریں گے۔'' ......''امریکا اسامہ کے بہانے تباہی پھیلا رہا ہے، اس کا اصل مقصد پاکستان پر قبضہ کرنا ہے۔'' ......''افغانستان پر امریکی حملوں کو ہم صلیبی جنگوں کا آغاز سمجھتے ہیں۔'' ......''امریکا نے حملہ کر کے اپنی موت کو آواز دی ہے۔'' ......''ہمارے مجاہد افغانستان جا کر طالبان کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لیں گے۔ اس سلسلے میں مجاہدین کی رجسٹریشن شروع کر دی گئی ہے، ان شاءاللہ فتح طالبان کی ہوگی۔'' (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، ۲۲ ستمبر ۲۰۰۱، روزنامہ جنگ، ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱)

_______ منظور الحسن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۳۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ، اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ، فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ

ایمان والو، (تم میں) جو لوگ قتل کر دیے جائیں، اُن کا قصاص[۴۶۴] تم پر فرض کیا گیا ہے[۴۶۵]۔ اِس طرح کہ قاتل آزاد ہو تو اُس کے بدلے میں وہی آزاد، غلام ہو تو اُس کے بدلے میں وہی غلام، عورت ہو تو اُس کے بدلے میں وہی عورت[۴۶۶]۔ پھر جس کے لیے اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی[۴۶۷] تو چاہیے کہ

[۴۶۴] قصاص 'قصص' سے ہے جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے اس کے نقش قدم کے ساتھ چلنے کے ہیں۔ اسی سے یہ اس سزا کے لیے استعمال ہوا جس میں مجرم کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو اس نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔

[۴۶۵] اس حکم کا تعلق مسلمانوں کے پورے معاشرے سے ہے۔ 'کتب علیکم' کا مخاطب وہی ہے۔ چنانچہ یہ فرض معاشرے کے نظم اجتماعی پر عائد ہوتا ہے کہ اس کے دائرۂ اختیار میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو اس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، انھیں گرفتار کرے اور قانون کے مطابق مقتول کے اولیا کی مرضی ان پر ٹھیک ٹھیک نافذ کر دے۔

[۴۶۶] یہ اس بے لاگ انصاف اور کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھی جائے گی۔ قرآن کے اس حکم نے قدیم و جدید جاہلیت کی تمام ناانصافیوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام، سب کو ایک ہی آدم و حوا کی اولاد مان کر اس معاملے میں بالکل ایک ہی سطح پر رکھا جائے گا۔ کسی شخص کا معاشرتی اور سماجی مرتبہ

بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ۔ ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ رَحۡمَةٌ فَمَنِ

دستور کے مطابق اُس کی پیروی کی جائے[۴۶۸] اور (جو کچھ بھی خون بہا ہو) وہ خوبی کے ساتھ اُسے ادا کر دیا

ہرگز کسی ترجیح کا باعث نہ بنے گا اور قانون وعدالت ہر ایک کے ساتھ بالکل یکساں معاملہ کریں گے۔

[۴۶۷] یعنی اگر مقتول کے وارثوں کی طرف سے قاتل کو کچھ چھوٹ دے دی گئی۔ اس کی جو صورت یہاں مراد ہے، وہ یہ ہے کہ جان کے بدلے جان کے بجائے وہ خون بہا لینا قبول کر لیں۔ آگے 'اداء الیہ باحسان' کے الفاظ سے یہ معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قصاص کا معاملہ شریعت کی رو سے قابل راضی نامہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک قصاص لینے کے فرض کا تعلق ہے، وہ تو حکومت ہی پر عائد ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ پابند ہے کہ خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے یہ اختیار مقتول کے وارثوں کو دے دے کہ وہ قانون کے حدود میں رہتے ہوئے چاہیں تو مجرم کو قتل کر دیں اور چاہیں تو اس سے دیت قبول کر لیں۔ وارثوں کے اس اختیار کو نافذ کر دینے کے بعد حکومت اس فرض سے سبک دوش ہو جائے گی جو 'کتب علیکم القصاص فی القتلی' کی رو سے اس پر عائد ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو اس معاملے میں شریعت کا یہی اصول ہے جو اسے موجودہ قوانین سے ممتاز کرتا ہے اور مجرم کو اس طریقے سے ان لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر جن کے خلاف جرم کا ارتکاب ہوا ہے، نہ صرف یہ کہ ان کی آتش انتقام بجھا دیتا ہے، بلکہ قتل جیسے جرائم سے مسموم معاشروں میں اس زہر کا تریاق بن جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''قصاص کے معاملے میں مقتول کے اولیا کی مرضی کو اسلام نے یہ اہمیت جو دی ہے، یہ مختلف پہلووں سے نہایت حکیمانہ ہے۔ قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہ راست اختیار مل جانے سے ایک تو ان کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اس کے خاندان پر یہ ان کا براہ راست احسان ہوتا ہے جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۳۳)

اس میں یہ بات البتہ، بالبداہت واضح ہے کہ مقتول اگر لاوارث ہو یا اس کے وارث تو ہوں، لیکن وہ کسی وجہ سے مقتول کے معاملے میں کوئی دل چسپی نہ رکھتے ہوں یا ان کی اصل دل چسپی ہی کسی سبب سے مقتول کے بجائے قاتل اور اس کے شرکا کے ساتھ ہو جائے تو حکومت یقیناً مدعی ہو گی اور وہی اختیار جو مقتول کے اولیا کو حاصل ہے، وہ اس صورت میں اسے حاصل ہو جائے گا۔

[۴۶۸] اصل الفاظ ہیں: 'فاتباع بالمعروف'۔ لفظ 'معروف' قرآن میں بھلائی اور خیر کے معنی میں بھی آیا ہے اور رواج اور دستور کے معنی میں بھی۔ یہاں 'اداء الیہ باحسان' کے الفاظ اس کے بعد دلیل ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ قرآن نے دیت کی کوئی خاص مقدار خود متعین کر دینے کے بجائے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس معاملے میں معاشرے کے دستور کی پیروی کریں۔ قرآن کے اس حکم کے مطابق ہر معاشرہ اپنے ہی دستور کا پابند ہے۔ جس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ـ وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِی

جائے۔[۴۶۹] یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک قسم کی رعایت اور تم پر اُس کی عنایت ہے۔[۴۷۰] پھر اِس کے بعد جو زیادتی کرے تو اُس کے لیے (قیامت میں) دردناک سزا ہے[۴۷۱] ـــــــ اور تمھارے لیے قصاص میں

معاشرے میں دیت کا کوئی قانون پہلے سے موجود نہیں ہے، وہاں مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو اختیار ہے کہ چاہیں تو عرب کے اس دستور کو برقرار رکھیں جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں دیت کے فیصلے کیے اور چاہیں تو اس کی کوئی دوسری صورت تجویز کریں۔ وہ جو صورت بھی اختیار کریں گے، معاشرہ اسے قبول کر لیتا ہے تو اس کے لیے وہی دستور قرار پائے گی اور اس کے مطابق دیت ادا کر دینے سے قرآن کا منشا یقیناً پورا ہو جائے گا۔

[۴۶۹] یہ خوبی کے ساتھ دیت ادا کرنے کا حکم جس وجہ سے دیا ہے، اس کی وضاحت میں استاذ امام نے لکھا ہے:

''حسن وخوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اس لیے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی بالعموم نقد کی صورت میں نہیں، بلکہ جنس ومال کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہوتی تو وہ اس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں کی تعداد یا غلہ اور کھجور کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا کر دیا جائے، لیکن باعتبار حقیقت وکیفیت اس کی حیثیت محض خانہ پری ہی کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی جنھوں نے ایک شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اس کو معاف کر دیا اور اس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے۔ ان کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیے۔ یعنی دیت کی ادائیگی اس خوبی، فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ ان کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۳۴)

[۴۷۰] مطلب یہ ہے کہ حرمت جان کا اصل حق تو یہی تھا کہ جان کے بدلے جان لی جاتی، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ اس نے اس معاملے میں رعایت فرما دی ہے۔ لہٰذا اب اس رعایت سے کسی شخص کو کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

[۴۷۱] اس کی تفسیر میں استاذ امام لکھتے ہیں:

''اس میں قاتل اور اس کے خاندان والوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد یہ انتہائی کفران نعمت ہوگا کہ اس کے پردے میں مقتول کے خاندان پر کسی نئے ظلم کے لیے اسکیم بنائی جائے۔ مثلاً یہ کہ قاتل اور اس کے اعزہ یہ منصوبہ بنائیں کہ اس وقت تو کسی طرح مقتول کے ورثا کو راضی کر کے اپنی جان بچالو، پھر موقع پیدا کر کے اس کو

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مزید نقصان پہنچائیں گے۔ اسی طرح اس میں مقتول کے وارثوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ انھیں اپنے دل میں یہ منصوبہ رکھ کے دیت کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت تو قاتل سے دیت لے لیتے ہیں، بعد میں موقع ملنے پر اس کی جان بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ خدا کی بخشی ہوئی ایک رعایت کے تحت جو راضی نامہ ہو گیا ہے، دونوں فریقوں کو سچے دل سے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ جو بھی یہ راضی نامہ ہو چکنے کے بعد کوئی زیادتی کرے گا، وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھیرے گا۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۳۴)

[۴۷۲] یہ قرآن نے خاص طور پر اہل عقل کو مخاطب کر کے اس قانون کی حکمت بیان فرمائی ہے تاکہ لوگ نہ قصاص کے معاملے میں کسی سہل انگاری، چشم پوشی، جانب داری اور بے جا رحم و مروت کو حائل ہونے دیں اور نہ جذبات سے مغلوب ہو کر جرم و سزا کے معاملے میں اس طرح کے فلسفے پیش کرنے کی جسارت کریں جو اس زمانے میں بعض لوگوں نے مجرموں کی وکالت کرتے ہوئے پیش فرمائے ہیں۔ استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں، بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے تو بظاہر تو ایک جان کے بعد یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اگر دیکھیے تو اس کے قتل سے پورے معاشرے کے لیے زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے تو یہ جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے، وہ خرابی پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے۔ جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں، ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے جن میں پورے جسم کو بچانے کے لیے بسا اوقات جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگ دلی کا کام معلوم ہوتا ہے، لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگ دلی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے یہ سنگ دلی اختیار نہ کرے تو اس ایک عضو کی ہم دردی میں اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالے کرنا پڑے گا۔

معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات اسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے جس کا علاج مرہم و ضماد سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ عضو مریض پر آپریشن کر کے اس کو جسم کے مجموعے سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے، اس وجہ سے نرمی اور ہم دردی کا مستحق ہے تو اس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ عضو سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۳۶)

(باقی)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

طالب محسن

تقدیر اور عمل

(مشکوٰۃ المصابیح حدیث:۸۵)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عن علی رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم: ما منكم من أحد إلا و قد كتب مقعده من النار و مقعده من الجنة ۔ قالوا يا رسول اللّٰه، أفلا نتكل على كتابنا و ندع العمل؟ قال: اعملوا فكل ميسر لما خلق له، و اما من كان من أهل السعادة فسييسر لعمل السعادة، و أما من كان من اهل الشقاوة فسييسر لعمل الشقاوة ۔ ثم قرأ: 'فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی ۔ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۔ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۔ وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی ۔ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۔ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی' ۔

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایک نہیں ہے، مگر یہ کہ اس کا جہنم کا ٹھکانا اور جنت کا ٹھکانا لکھ دیا گیا ہو۔ لوگوں نے کہا: یارسول اللہ، کیوں نہ ہم اپنے لکھے پر بھروسا کریں اور عمل چھوڑ دیں۔ آپ نے واضح کیا۔ عمل کرو کیونکہ ہر ایک کو اس کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ جو اہل سعادت میں سے ہوتے ہیں، انھیں سعادت کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ اور وہ جو بدنصیبوں میں سے ہوتے ہیں، انھیں بدنصیب کے

اعمال کی توفیق دی جاتی ہے۔ پھر آپ نے (سورۂ لیل کی ان آیات کی) تلاوت کی: ''چنانچہ وہ جس نے دیا، تقویٰ کی راہ اختیار کی اور اچھی راہ کی تصدیق کی تو ہم اس کے لیے جلد آسانی کا سامان کریں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروائی کی اور اچھائی کو جھٹلایا تو ہم اس کے لیے جلد تنگی کا سامان کریں گے۔''''

لغوی مباحث

مقعدہ من النار و مقعدہ من الجنۃ: اس 'و' کے بارے میں یہ سوال ہے کہ آیا ہر شخص کے لیے دونوں جگہ جانا ضروری ہے۔ اس کا ایک حل یہ کیا گیا ہے کہ یہ برزخی زندگی سے متعلق ہے۔ حدیث کا مضمون اس تاویل کو قبول نہیں کرتا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ 'و' 'أو' کے معنی میں ہے۔

السعادۃ: لفظی معنی تو خوش بختی کے ہیں، لیکن یہاں اس کا اطلاق دنیا میں ایمان و عمل صالح کی توفیق اور آخرت میں رضاے الٰہی اور جنت کے حصول پر ہوا ہے۔

الشقاوۃ: لفظی معنی دل کی سختی کے ہیں۔ یہ 'سعادۃ' کے بالمقابل بدبختی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس حدیث میں اس سے مراد ایمان کی حقیقت اور عمل صالح کی توفیق سے محرومی اور نتیجۃً جہنم کا انجام ہے۔

سییسر: 'یسر' کسی کے لیے کسی شے کے حصول کو آسان بنانے کے معنی میں آتا ہے۔ اسی سے یہ نیک و بد کی توفیق دیے جانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

صدق بالحسنی: ''اس نے 'حسنی' کی تصدیق کی'' سے کیا مراد ہے؟ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حسنی' کا موصوف 'عاقبۃ' یا اس کے کوئی ہم معنی لفظ محذوف ہے۔ یعنی وہ انفاق یا نیکی کے اچھے انجام پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ ان کی نیکی کے اصل محرک کا پتا دیا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴۰۳/۹)

متون

ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس گفتگو کا پس منظر بھی بیان ہوا ہے:

کنا فی جنازۃ فی بقیع الغرقد۔ فأتانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقعد وقعدنا حولہ ومعہ مخضرۃ۔ فنکس۔ فجعل	''ہم بقیع غرقد میں ایک جنازے میں شریک تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے پاس آ گئے۔ آپ بیٹھ گئے اور ہم بھی ان کے گرد بیٹھ گئے۔ آپ کے ہاتھ میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ینکت بمخضرته۔ ثم قال: ما منکم من أحد وما من نفس منفوسة الا کتب مکانه من الجنة و النار والا قد کتب شقية و سعيدة۔ (بخاری، رقم ۱۲۷۴)

ایک سبز شاخ تھی۔ آپ نے سر جھکایا اور شاخ کی نوک زمین پر مارنے لگے۔ پھر فرمایا: نہ تم میں سے کوئی ایسا ہے اور نہ پیدا ہونے والی کوئی جان ایسی ہے جس کا جنت یا جہنم میں ٹھکانا اور جس کا شقی یا سعید ہونا لکھ نہ دیا گیا ہو۔''

ایک روایت کا آغاز صرف ان الفاظ سے ہوا ہے: 'کنا جلوسا عند النبی صلی اللّٰه عليه وسلم فقال ......'۔ ایک روایت میں 'قد کتب مقعده' کے بجائے 'قد علم منزلها من الجنة و النار' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے فرق معمولی نوعیت کے ہیں۔ بعض روایات مفصل اور بعض مختصر ہیں۔ اسی طرح بعض روایات کے کچھ الفاظ اس روایت سے مختلف ہیں۔ لیکن مضمون میں ان سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ایک آدھ روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن مجید سے استدلال نقل نہیں ہوا۔ اگرچہ اس روایت کے مفہوم اور آیات کے مفہوم میں کافی بعد ہے۔ اس وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس استدلال کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت درست نہ ہو اور جن راویوں نے اسے نقل نہیں کیا، ان کی روایت ہی زیادہ درست ہو۔ لیکن تمام اہم محدثین نے استدلال والی روایت نقل کی ہے۔ اس لیے اسے اصل روایت کی حیثیت دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معنی

اس روایت کے محل غور پہلو تین ہیں :

ایک یہ کہ انجام لکھ دیے جانے سے کیا مراد ہے؟

دوسرے یہ کہ انجام کے متعین ہونے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انحصار کو کیوں درست نہیں سمجھا؟

تیسرے یہ کہ روایت میں جن آیات سے استشہاد کیا گیا ہے، بظاہر ان کا روایت کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اس تضاد کا حل کیا ہے؟

ہم یہ بات اس سے پہلے کی روایات کی وضاحت میں بیان کر چکے ہیں کہ نیکی و بدی کا معاملہ سر تا سر ہمارے اختیار میں ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر یہ بات بیان کی ہے کہ ہدایت وضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے دونوں راہیں کھلی رکھی ہیں۔ جو آدمی راہ حق کو اختیار کرنا چاہتا ہے، اسے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی اور جو برائی کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے، اسے اس کا پورا موقع حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ روایات میں انجام کے لکھے جانے کے الفاظ سے یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کا انجام پہلے سے متعین کر رکھا ہے۔ دوزخ کے لیے پیدا کیے

گئے لوگ جنت میں نہیں جا سکتے اور جہنم کے لیے تخلیق کیے گئے لوگ بہشت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس بیان کی اس کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مستقبل کے علم کی بنیاد پر ہر شخص کی کارکردگی کو دیکھ لیا ہے اور اسے لکھ بھی دیا ہے۔ یعنی معاملہ یہ نہیں ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے طے کیا کہ فلاں شخص یہ اور یہ کرے اور اس کے بعد اس طے شدہ پروگرام کو لکھ دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر کے اختیار کرنے کی کامل آزادی دی۔ پھر اپنے علم جو ماضی حال اور مستقبل سب پر حاوی ہے کی بنیاد پر یہ لکھ دیا کہ فلاں یہ اور یہ کرے گا۔ غرض یہ کہ یہ علم انسان کی آزادیِ ترک و اختیار پر کوئی قدغن عائد نہیں کرتا۔

ہماری اس بات سے دوسرا نکتہ آپ سے آپ واضح ہو جاتا ہے۔ جب معاملہ جبر کا نہیں ہے۔ ہر انسان خیر و شر کے اختیار کرنے میں کامل آزاد ہے اور اس کا انجام اس کے کیے ہوئے اعمال پر منحصر ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ترکِ عمل کی تلقین کسی طرح نہیں کر سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل درست فرمایا کہ ہر شخص کو خیر کی راہ پر چلنا چاہیے تاکہ وہ خدا کے سعادت مند بندوں میں شامل ہو اور وہ برائیوں کو چھوڑے تاکہ بدبختوں میں سے نکل جائے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ روایت میں یہ بات جن الفاظ میں کہی گئی ہے، ان سے یہ مفہوم اخذ کرنا ناممکن ہے۔ الفاظ کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ بات مان لی جائے کہ کچھ لوگوں کے لیے جنت مقدر ہے اور کچھ لوگوں کے لیے جہنم مقدر ہے۔ جنت والوں کو اچھے اعمال کی توفیق دی جاتی ہے اور جہنم والوں کو برے اعمال کے مواقع دیے جاتے ہیں۔ حدیث کے یہ الفاظ اور ان کا یہ مفہوم قرآن مجید کے صریحاً خلاف ہے۔ لہٰذا اس بات کو کسی صورت میں بھی نہیں مانا جا سکتا۔ ہمارا گمان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی بات فرمائی ہوگی جس کی تفصیل ہم نے اوپر کے پیراگراف میں کی ہے۔ قرین قیاس یہی لگتا ہے کہ روایت ہونے میں بات تبدیل ہوگئی ہے۔

تیسرا نکتہ روایت کے ظاہری معنی اور آیات کے مفہوم کے تضاد سے متعلق ہے۔ پہلے آیات کے سیاق پر ایک نظر ڈال لیجیے:

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى۔ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى۔ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۔ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۔ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى۔ وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۔ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۔ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى۔ (اللیل۹۲: ۱۔۱۰)

”شاہد ہے رات جبکہ چھا جاتی ہے اور دن جبکہ چمک اٹھتا ہے اور شاہد ہے نر و مادہ کی آفرینش کہ تمھاری (آخرت کی) کمائی الگ الگ ہے۔ سو جس نے انفاق کیا اور پرہیز گاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ جانا، اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا، اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔“

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے ان آیات کی وضاحت میں لکھا ہے:

''عقل اور فطرت کا بدیہی تقاضا ہے کہ نیکوں اور بدوں، دونوں کی سعی کا نتیجہ ایک ہی شکل میں برآمد نہ ہو، بلکہ ان کی جدوجہد کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔ جنھوں نے نیکی کمائی ہو، وہ اس کا صلہ فضل و انعام کی شکل میں پائیں اور جنھوں نے بدی کمائی ہو، وہ اس کے انجام سے دوچار ہوں۔

'فاما من اعطی' یہ تفصیل ہے اس فرق و اختلاف کی جو لازماً نیکوں اور بدوں کی کمائی میں رونما ہوگا اور جس کو رونما ہونا چاہیے بھی۔ فرمایا جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا، اپنے رب سے ڈرے گا، اچھے انجام کو سچ مانے گا، اس کو تو ہم آسان راہ پر چلائیں اور آسانی کی منزل تک پہنچائیں گے۔

'اعطی' کے بعد 'و اتقی' کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس انفاق سے مقصود ریا و نمایش یا کوئی اور دنیوی چیز نہ ہو، بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی کی تمنا اور ایک ایسے دن کا خوف ہو جس دن نیک عمل کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں بنے گی۔

'فسنیسرہ للیسری' یہ اس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جو شخص نیکی کی راہ اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس راہ کی مشکلات آسان کرتا اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کی توفیق بخشتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۹/۴۰۲)

ان آیات میں یہ بات بیان نہیں ہوئی کہ اصل فیصلہ تقدیر کا ہے، بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اللہ کی دنیا میں توفیق اور آخرت کا انجام انسان کے اپنے عمل کے انعام کی صورت میں نکلتا ہے۔ روایت اس کے برعکس اعمال کو خدا کے فیصلے پر منحصر قرار دیتی ہے۔ یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات اس بات کو واضح کرنے کے لیے بیان کی ہوں گی کہ تم نیکی کا ارادہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دیں گے اور برائی کا فیصلہ کرو گے تو اللہ اس کے لیے مہلت دیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرنے کی تلقین کرنا اور ان آیات سے استشہاد اس بات کو واضح کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی بات فرمائی ہے جو قرآن مجید کے مطابق ہے۔ لیکن روایت ہونے میں الفاظ پوری صحت کے ساتھ نقل نہیں ہو سکے۔

کتابیات

بخاری: کتاب الجنائز، رقم ۱۲۷۴۔ کتاب تفسیر القرآن، رقم ۴۵۶۴، ۴۵۶۵، ۴۵۶۶، ۴۵۶۷، ۴۵۶۸۔ کتاب الادب، رقم ۵۷۴۹۔ کتاب القدر، رقم ۶۱۱۵۔ کتاب التوحید، رقم ۶۹۹۷۔ مسلم: کتاب القدر، رقم ۴۷۸۶، ۴۷۸۷۔ ترمذی: کتاب القدر، رقم ۲۰۶۲۔ کتاب تفسیر القرآن، رقم ۳۲۶۷۔ ابن ماجہ: کتاب المقدمہ، رقم ۷۵۔ مسند احمد: رقم ۵۸۷، ۱۰۱۵، ۱۰۵۵، ۱۱۲۰، ۱۲۷۸، ۱۶۰۳۵، ۱۶۰۳۶، ۱۹۰۲۳۔ صحیح ابن حبان: ۲/۴۳۔ السنن الکبریٰ: ۶/۵۱۷۔ الجامع از معمر بن راشد: ۱۱/۱۱۱۔ مسند ابی یعلیٰ: ۴/۴۵۔ مسند عبد بن حمید: ۱/۵۷۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون معاشرت

(۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

محرمات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَلَا تَنْکِحُوْا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِیْلًا۔ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّهٰتُکُمْ وَ بَنٰتُکُمْ وَ اَخَوٰتُکُمْ وَ عَمّٰتُکُمْ وَ خٰلٰتُکُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُکُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِکُمْ وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ، فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ، وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ، اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، اِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ، کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ۔ (النساء۴: ۲۲۔۲۴)

''اور اُن عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں، مگر جو ہو چکا سو ہو چکا۔ بے شک، یہ کھلی بے حیائی، نفرت انگیز فعل اور نہایت برا طریقہ ہے۔ تم پر تمھاری مائیں، تمھاری بیٹیاں، تمھاری بہنیں، تمھاری پھوپھیاں، تمھاری خالائیں، تمھاری بھتیجیاں اور تمھاری بھانجیاں حرام کی گئی ہیں اور تمھاری وہ مائیں بھی جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور رضاعت کے اس تعلق سے تمھاری بہنیں بھی۔ (اِسی طرح) تمھاری بیویوں کی مائیں اور اُن کی لڑکیاں جو تمھاری گودوں میں پلی ہیں، اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تم نے خلوت کی ہو، لیکن اگر خلوت نہ کی ہو تو کچھ گناہ نہیں ——— اور تمھارے صلبی بیٹوں کی بیویاں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو ایک ہی نکاح میں جمع کرو، مگر جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اللہ یقیناً بخشنے والا ہے،

اس کی شفقت ابدی ہے۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی کے نکاح میں ہوں، الّا یہ کہ وہ ملک یمین ہوں۔ یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے۔''

یہ ان عورتوں کی فہرست ہے جن سے نکاح ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس کی تمہید سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کی حرمت سے اٹھائی گئی ہے اور خاتمہ ان عورتوں سے نکاح کی ممانعت پر ہوا ہے جو کسی دوسرے کے عقد میں ہوں۔ اس تمہید و خاتمہ کے درمیان جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں، وہ رشتہ داری کے اصول ثلاثہ، یعنی نسب، رضاعت اور مصاہرت پر مبنی ہیں۔

عرب جاہلی کے بعض طبقوں میں رواج تھا کہ باپ کی منکوحات بیٹے کو وراثت میں ملتی تھیں اور بیٹے انھیں بیوی بنا لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے فرمایا کہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی، نہایت قابل نفرت فعل اور نہایت برا طریقہ ہے، لہٰذا اسے اب بالکل ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، لیکن آیندہ کسی مسلمان کو اس فعل شنیع کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔

یہی معاملہ اس عورت کا ہے جو کسی شخص کے نکاح میں ہو۔ شوہر سے باقاعدہ علیحدگی کے بغیر کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح کا حق نہیں رکھتا۔ بالبداہت واضح ہے کہ نکاح کا طریقہ خاندان کے جس ادارے کو وجود میں لانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے، وہ اس کے نتیجے میں ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے ممنوع ٹھیرایا ہے۔ زمانۂ رسالت کی لونڈیاں، البتہ اس سے مستثنیٰ تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسروں سے نکاح کے باوجود ان کے مالکوں کا حق ملکیت ان میں قائم رہتا تھا اور وہ اگر اسے استعمال کرنا چاہتے تو ان کے شوہروں کا حق آپ سے آپ کالعدم ہو جاتا تھا۔ 'الا ما ملکت ایمانکم' میں قرآن نے یہی استثنا بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد کی آیت میں اسی بنا پر فرمایا ہے کہ جو عورتیں اس طرح دوسروں کی ملکیت میں ہیں، ان سے نکاح آدمی کو کسی مجبوری کی حالت ہی میں کرنا چاہیے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ ، فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ، بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ... ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ، وَاَنْ

''اور جو تم میں سے آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کی مقدرت نہ رکھتا ہو، وہ اُن مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لے جو تمھاری ملکیت میں ہوں۔ اللہ تمھارے ایمان سے خوب واقف ہے۔ تم سب ایک ہی جنس سے ہو۔ لہٰذا ان لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کرو، اس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن رکھی گئی ہوں، نہ علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ چوری

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ، وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۔ (النساء۴: ۲۵)

چھپے آشنائی کرنے والی ہوں ... یہ اجازت تم میں سے اُن کے لیے ہے جن کے مشکل میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو، اور صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔''

اس کے بعد اب باقی حرمتوں کو لیجیے۔

نسب

پہلے نسبی حرمتیں بیان ہوئی ہیں۔ ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی، یہی وہ سات رشتے ہیں جن کی قرابت اپنے اندر فی الواقع اس نوعیت کا تقدس رکھتی ہے کہ اس میں جنسی رغبت کا شائبہ بھی ہو تو اسے فطرت صالحہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ تقدس ہی درحقیقت تمدن کی بنیاد، تہذیب کی روح اور خاندان کی تشکیل کے لیے رأفت و رحمت کے بے لوث جذبات کا منبع ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ماں کے لیے بیٹے، بیٹی کے لیے باپ، بہن کے لیے بھائی، پھوپھی کے لیے بھتیجے، خالہ کے لیے بھانجے، بھانجی کے لیے ماموں اور بھتیجی کے لیے چچا کی نگاہ جنس و شہوت کی ہر آلایش سے پاک رہے اور عقل شہادت دیتی ہے کہ ان رشتوں میں اس نوعیت کا علاقہ شرف انسانی کا ہادم اور شرم و حیا کے اس پاکیزہ احساس کے بالکل منافی ہے جو انسانوں اور جانوروں میں وجہ امتیاز ہے۔

ان کا جو حکم یہاں بیان ہوا ہے، وہ ہر لحاظ سے بالکل متعین ہے۔ تاہم یہ تین باتیں اس کے بارے واضح رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ عربی زبان کے جو الفاظ اس حکم میں استعمال ہوئے ہیں، ان میں سگے اور سوتیلے کے درمیان فرق کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ چنانچہ سگی اور سوتیلی ماں، سگی بہن، ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن، یہ سب اس حکم میں یکساں ہوں گی۔ اسی طرح ماں اور باپ کی بہن خواہ سگی ہو یا سوتیلی یا باپ شریک، اس کا حکم بھی یہی ہو گا۔ یہی معاملہ بھائی اور بہن کی بیٹیوں کا ہے۔ وہ سگے ہوں یا سوتیلے، ان کی بیٹیوں کو اسی کے تحت سمجھا جائے گا۔

دوسری یہ کہ ماں کا لفظ باپ کی ماں اور ماں کی ماں کو اوپر تک شامل ہے اور بیٹی کا لفظ بھی پوتی اور نواسی کو نیچے تک شامل ہے۔ ان میں حکم کے لحاظ سے ہرگز کوئی فرق نہ ہو گا۔

تیسری یہ کہ نانا کی بہن اور دادی کی بہن بھی بالترتیب پھوپھی اور خالہ ہی ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اس حکم میں یکساں شامل ہوں گی۔

رضاعت

یہی تقدس رضاعی رشتوں میں بھی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''رضاعت کے تعلق کو لوگ ہمارے ہاں اس گہرے معنی میں نہیں لیتے، جس معنی میں اس کو لوگ عرب میں لیتے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کا سبب محض رواج کا فرق ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اس کو مادرانہ رشتے سے بڑی گہری مناسبت ہے۔ جو بچہ جس ماں کی آغوش میں، اس کی چھاتیوں کے دودھ سے پلتا ہے، وہ اس کی پوری نہیں تو آدھی ماں تو ضرور بن جاتی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس کا دودھ اس کے رگ و پے میں جاری وساری ہے، اس سے اس کے جذبات واحساسات متاثر نہ ہوں۔ اگر نہ متاثر ہوں تو یہ فطرت کا بناؤ نہیں، بلکہ بگاڑ ہے اور اسلام جو دین فطرت ہے، اس کے لیے ضروری تھا کہ اس بگاڑ کو درست کرے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۷۵)

یہ تعلق کس طرح دودھ پلانے سے قائم ہوتا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ تعلق مجرد کسی اتفاقی واقعے سے قائم نہیں ہو جاتا۔ قرآن نے یہاں جن لفظوں میں اسے بیان کیا ہے، اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ اتفاقی طور پر نہیں، بلکہ اہتمام کے ساتھ، ایک مقصد کی حیثیت سے عمل میں آیا ہو، تب اس کا اعتبار ہے۔ اول تو فرمایا ہے: ''تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہے۔'' پھر اس کے لیے رضاعت کا لفظ استعمال کیا ہے، ' واخواتکم من الرضاعة '۔ عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'ارضاع' باب افعال سے ہے جس میں فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی طرح رضاعت کا لفظ بھی اس بات سے ابا کرتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی روتے بچے کو بہلانے کے لیے اپنی چھاتی اس کے منہ میں لگا دے تو یہ رضاعت کہلائے گی۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۷۵)

قرآن کا یہ منشا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر واضح فرمایا ہے:

سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: ایک دو گھونٹ اتفاقاً پی لیے جائیں تو اس سے کوئی رشتہ حرام نہیں ہو جاتا۔[1]

سیدہ ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ آپ کو یہ ناگوار ہوا اور میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرے پر غصے کے آثار ہیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، یہ میرے رضاعی بھائی ہیں۔ آپ نے فرمایا: اپنے ان بھائیوں کو دیکھ لیا کرو، اس لیے کہ رضاعت کا تعلق تو صرف اس دودھ سے قائم ہوتا ہے جو بچے کو دودھ کی ضرورت کے زمانے میں پلایا جائے۔[2]

یہاں کسی شخص کو ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے منہ بولے بیٹے سالم کی بڑی عمر میں رضاعت سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اس واقعے سے معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ منہ بولے بیٹوں کے بارے میں قرآن کا حکم آ جانے کے بعد جو صورت حال ایک گھرانے کے لیے پیدا ہو گئی، اس سے نکلنے کا ایک طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بتایا ہے۔ اسے کسی مستقل حکم کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے:

---

[1] مسلم، رقم ۲۶۲۸۔

[2] مسلم، رقم ۲۶۴۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاء ت سهلة بنت سهيل بن عمرو القرشي ثم العامري ـــ وهي امراة ابي حذيفة ـــ فقالت : يا رسول الله ، انا كنا نرى سالماً ولداً ، و كان يأوي معي و مع ابي حذيفة في بيت واحد و يراني فضلا ، و قد انزل الله عزو جل فيهم ما قد علمت ، فكيف ترى فيه ؟ فقال لها النبي صلى الله عليه و سلم : أرضعيه ـ (ابوداؤد، رقم ۲۰۶۱)

''ابوحذیفہ کی بیوی اور سہیل بن عمرو قرشی عامری کی بیٹی سہلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ، ہم تو سالم کو اپنا بیٹا ہی سمجھتے تھے۔ وہ میرے اور ابوحذیفہ کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا تھا اور مجھے گھر کے کپڑوں میں دیکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جو حکم ان لڑکوں کے متعلق نازل کیا ہے، اس سے آپ واقف ہیں۔ اب بتایئے، اس معاملے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے اپنا دودھ پلا دو۔''

لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ رضاعت کے لیے دودھ کی عمر اور دودھ پلانے کا اہتمام، دونوں ضروری ہیں اور اس سے وہ سب رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسبی تعلق سے حرام ہوتے ہیں۔ قرآن کا مدعا یہی ہے، لیکن اس کے لیے عربیت کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ الفاظ و قرائن کی دلالت اور حکم کے عقلی تقاضے جس مفہوم کو آپ سے آپ واضح کر رہے ہوں، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا[۳]۔ ارشاد فرمایا ہے: 'و امھاتکم التی ارضعنکم و اخواتکم من الرضاعة' (اور تمھاری وہ مائیں بھی حرام ہیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور رضاعت کے اس تعلق سے تمھاری بہنیں بھی)۔ اس میں دیکھ لیجیے، رضاعی ماں کے ساتھ رضاعی بہن کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ بات اگر رضاعی ماں ہی پر ختم ہو جاتی تو اس میں بے شک، کسی اضافے کی گنجایش نہ تھی، لیکن رضاعت کا تعلق اگر ساتھ دودھ پینے والی کو بہن بنا دیتا ہے تو عقل تقاضا کرتی ہے کہ رضاعی ماں کے دوسرے رشتوں کو بھی یہ حرمت لازماً حاصل ہو۔ دودھ پینے میں شراکت کسی عورت کو بہن بنا سکتی ہے تو رضاعی ماں کی بہن کو خالہ، اس کے شوہر کو باپ، شوہر کی بہن کو پھوپھی اور اس کی پوتی اور نواسی کو بھتیجی اور بھانجی کیوں نہیں بنا سکتی؟ لہٰذا یہ سب رشتے بھی یقیناً حرام ہیں۔ یہ قرآن کا منشا ہے اور 'اخواتکم من الرضاعة' کے الفاظ اس پر اس طرح دلالت کرتے ہیں کہ قرآن پر تدبر کرنے والے کسی صاحب علم سے اس کا یہ منشا کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فرمایا ہے:

يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة۔ (المؤطا، رقم ۱۲۹۱)

''ہر وہ رشتہ جو ولادت کے تعلق سے حرام ہے، رضاعت سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔''

۳؎ اس اسلوب کو سمجھنے کے لیے دیکھیے، اسی کتاب میں: ''اصول و مبادی''۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مصاہرت

نسب اور رضاعت کے بعد وہ حرمتیں بیان ہوئی ہیں جو مصاہرت پر مبنی ہیں۔ اس تعلق سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں، ان کا تقدس بھی فطرت انسانی کے لیے ایسا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ باپ کے لیے بہو اور شوہر کے لیے بیوی کی ماں، بیٹی، بہن، بھانجی اور بھتیجی، یہ سب حرام ہیں۔ تاہم یہ رشتے چونکہ بیوی اور شوہر کی وساطت سے قائم ہوتے ہیں اور اس سے ایک نوعیت کا ضعف ان میں پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے قرآن نے یہ تین شرطیں ان پر عائد کر دی ہیں:

ایک یہ کہ بیٹی صرف اس بیوی کی حرام ہے جس سے خلوت ہو جائے۔

دوسری یہ کہ بہو کی حرمت کے لیے بیٹے کا صلبی ہونا ضروری ہے۔

تیسری یہ کہ بیوی کی بہن، بھانجی اور بھتیجی کی حرمت اس حالت کے ساتھ خاص ہے، جب میاں بیوی میں نکاح کا رشتہ قائم ہو۔

پہلی بات قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے: 'وربائبکم التی فی حجورکم من نسائکم التی دخلتم بھن، فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم' (اور تمھاری بیویوں کی لڑکیاں جو تمھاری گودوں میں پلی ہیں، ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تم نے خلوت کی ہو، لیکن اگر خلوت نہ کی ہو تو کچھ گناہ نہیں)۔ اس میں خلوت کی شرط کے ساتھ لڑکیوں کی ایک صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ تمھاری گودوں میں پلی ہیں، لیکن صاف واضح ہے کہ اس کی حیثیت حرمت کے لیے شرط کی نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''عربی زبان میں ہر صفت کو لازماً قید وشرط کی حیثیت حاصل نہیں ہو جاتی کہ ان میں سے کوئی نہ پائی جائے تو وہ حکم کالعدم ہو جائے، بلکہ اس کا انحصار قرینے پر ہوتا ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ کون سی صفت قید اور شرط کا درجہ رکھتی ہے اور کون سی صفت محض تصویر حال کے لیے ہے۔ یہاں صرف قرینہ ہی نہیں، بلکہ تصریح ہے کہ ربیبہ کی ماں اگر تمھاری مدخولہ نہ بنی ہو تو اس ربیبہ سے نکاح میں کوئی قباحت نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ربیبہ کی حرمت میں اصل مؤثر چیز اس کی ماں کا مدخولہ ہونا ہے۔ اگر وہ مدخولہ ہے تو اس کی لڑکی سے نکاح ناجائز ہوگا، قطع نظر اس سے کہ وہ آغوش تربیت میں پلی ہے یا نہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اعلیٰ عربی، بالخصوص قرآن حکیم میں اثبات کے بعد نفی کے اسلوب یا نفی کے بعد اثبات کے اسلوب میں جو باتیں بیان ہوتی ہیں وہ محض سخن گسترانہ نہیں ہوتیں، بلکہ کسی خاص فائدے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان سے مقصود اکثر صورتوں میں رفع ابہام ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کا خیال قرآن کے خلاف ہے جو ربیبہ کے ساتھ نکاح صرف اس صورت میں حرام سمجھتے ہیں، جب وہ نکاح کرنے والے کے آغوش تربیت میں پلی ہو۔ بصورت دیگر وہ اس کے ساتھ نکاح کو

جائز سمجھتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۷۶)

دوسری بات کے لیے قرآن کے الفاظ ہیں: 'و حلائل ابناءکم الذین من اصلابکم'، (اور تمھارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی)۔ اس میں صلبی ہونے کی شرط بالخصوص اس لیے عائد کی گئی ہے کہ اس زمانے کے عرب میں لوگ اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کو ناجائز سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس شرط سے واضح کر دیا کہ کسی کو اپنا بیٹا کہہ دینے سے نہ وہ بیٹا بن جاتا ہے اور نہ اس سے کوئی حرمت قائم ہوتی ہے۔ سورۂ احزاب میں یہ حقیقت قرآن نے اس طرح واضح فرمائی ہے:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَ كُمْ اَبْنَآءَ كُمْ ، ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ، وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ، وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ـ اُدْعُوْ هُمْ لِاٰبَآئِهِمْ، هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ، فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْآ اٰبَآءَ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ـ (۳۳: ۴۔۵)

''اور نہ اُس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا بیٹا بنایا ہے۔ یہ سب تمھارے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ حق کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ کے لیے رہنمائی کرتا ہے۔ اِن کو تم ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک قرین انصاف ہے۔ پھر اگر ان کے باپوں کو نہیں جانتے تو یہ دین میں تمھارے بھائی اور تمھارے رفیق ہیں۔''

تیسری بات 'و ان تجمعوا بین الاختین' (اور یہ کہ تم دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرو) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں بھی، اگر غور کیجیے تو زبان کا وہی اسلوب ہے جس کا ذکر اوپر رضاعت کی بحث میں ہوا ہے۔ قرآن نے 'بین الاختین' ہی کہا ہے، لیکن بالبداہت واضح ہے کہ زن و شو کے تعلق میں بہن کے ساتھ بہن کو جمع کرنا اسے فحش بنا دیتا ہے تو پھوپھی کے ساتھ بھتیجی اور خالہ کے ساتھ بھانجی کو جمع کرنا بھی گویا ماں کے ساتھ بیٹی ہی کو جمع کرنا ہے۔ لہٰذا قرآن کا مدعا، لاریب یہی ہے کہ 'ان تجمعوا بین الاختین و بین المرأة و عمتها و بین المرأة و خالتها'۔ وہ یہی کہنا چاہتا ہے، لیکن 'بین الاختین' کے بعد یہ الفاظ اس نے اس لیے حذف کر دیے ہیں کہ مذکور کی دلالت اپنے عقلی اقتضا کے ساتھ اس محذوف پر ایسی واضح ہے کہ قرآن کے اسلوب سے واقف اس کا کوئی طالب علم اس کے سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا يجمع بين المرأة و عمتها ولا بين المرأة و خالتها ـ (المؤطا، رقم ۱۱۲۹)

''عورت اور اس کی پھوپھی ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہے، نہ عورت اور اس کی خالہ۔''

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد عمار خان ناصر

فقہ اسلامی میں غیر منصوص مسائل کا حل

(۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

احکام کی حکمت

شریعت کے تمام احکام خاص حکمتوں پر مبنی ہیں جن کا حصول ان احکام کے پورا کرنے سے مقصود ہوتا ہے۔ غیر منصوص مسائل میں بعض دفعہ عقلی لحاظ سے کئی پہلوؤں کا اختیار کرنا ممکن ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ دیکھنا چاہیے کہ احکام کی حکمت کی رعایت کس پہلو میں زیادہ ہے۔ اس اصول کا اطلاق حسب ذیل مسائل میں ہوتا ہے:

نمازوں کے اوقات

ایسے مقامات جہاں بعض نمازوں کا وقت نہ ملتا ہو، مثلاً آفتاب کے طلوع وغروب کے درمیان گھنٹا نصف گھنٹا کا فاصلہ رہتا ہو یا کئی کئی ماہ تک مسلسل دن یا رات رہتے ہوں تو وہاں نمازوں کا حکم کیا ہے؟ بعض فقہا نے محض ظاہر کو دیکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا کہ چونکہ وقت نماز کے لیے شرط ہے، اس لیے ان علاقوں میں وہ نمازیں فرض نہیں ہوں گی جن کا وقت نہیں ملتا۔ لیکن دوسری رائے، جو زیادہ معقول ہے، یہ ہے کہ شریعت کا اصل مطلوب ایک مخصوص وقت کے اندر پانچ نمازیں ہیں۔ اوقات ان نمازوں کے لیے محض علامت (sign) اور ظاہری سبب کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ حقیقی سبب کی۔ اس لیے مذکورہ علاقوں میں بھی چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ہی فرض ہوں گی اور ان کے اوقات قریبی علاقوں کے اوقات کے مطابق طے کیے جائیں گے۔

ٹیلی وژن سے نماز

نماز ایک زندہ روحانی عمل ہے اور اس میں قلبی کیفیات کو اصل مقصود کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھنے سے یگانگت اور وحدت کی جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں، وہ ٹیلی وژن یا ریڈیو کے پیچھے پڑھنے میں نہیں ہو سکتیں، چنانچہ مذکورہ صورتوں میں نماز درست نہیں ہو گی۔

نس بندی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے، اس میں تبدیلی اور اس کے تقاضوں سے انحراف دین میں حرام ہے۔ مردوں کے عورتوں سے اور عورتوں کے مردوں سے مشابہت اختیار کرنے کو اسی بنیاد پر حدیث میں قابل لعنت عمل قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول پر علما نے نس بندی کو حرام کہا ہے، کیونکہ مردانہ صلاحیت اور اس کا جائز استعمال اس فطرت کا تقاضا ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس فطرت کو ختم کرنے کا اختیار انسان کو نہیں دیا گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حسن کے لیے سرجری

سرجری کے طریقوں میں ترقی کے باعث یہ ممکن ہو گیا ہے کہ انسان اپنی شکل وشباہت کو سرجری کی مدد سے ایک خاص حد تک اپنی پسند کے مطابق بنوا لے۔ اسلام کے نزدیک انسانوں کی صورت گری مختلف حکمتوں کے تحت اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اچھی یا بری شکل دینے سے مقصود انسان کی آزمایش کرنا ہوتا ہے، اس لیے اللہ کی اس تقسیم کو قبول کرنا ہی بندگی کا تقاضا ہے۔ چنانچہ اگر محض حسن پیدا کرنے کے لیے سرجری کرائی جائے تو یہ حرام ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کی خلقت انسانوں کی عام خلقت سے مختلف ہو یا کسی حادثے کے نتیجے میں اصل شکل میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو سرجری کے ذریعے سے اس کا علاج درست ہو گا۔

حد میں مقطوع الید کی پیوندکاری

شریعت میں حدود کا مقصد محض مجرم کو سزا دینا نہیں، بلکہ اسے معاشرے کے لیے عبرت بنا دینا بھی ہے، لہٰذا سرجری کے ذریعے سے کسی ایسے شخص کے اعضا کو دوبارہ جوڑنا ناجائز ہو گا جس کا ہاتھ چوری میں یا جسم کا کوئی دوسرا حصہ قصاص میں کاٹا گیا ہو۔

روزہ میں انجکشن

علما کے مابین انجکشن سے روزہ ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک انجکشن مطلقاً ناقض ہے اور بعض رگ میں لگائے جانے والے انجکشن کو ناقض اور دوسرے کو غیر ناقض قرار دیتے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ انجکشن میں

کون سی صورت پائی جاتی ہے، علمانے یہ بات بطور اصول تسلیم کی ہے کہ اگر جسم کے اندر داخل کی جانے والی کوئی چیز کسی منفذ کے ذریعے سے دماغ یا معدہ تک پہنچ جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک روزے کا مقصد دراصل انسان کو اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت دینا ہے اور اس مقصد کے لیے شریعت میں اکل وشرب اور جماع کو ممنوع کیا گیا ہے۔ چونکہ علاج کی غرض سے کسی بھی قسم کی بیرونی دوا یا انجکشن استعمال کرنے سے اس مقصد پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے یہ چیزیں ناقض صوم نہیں ہوسکتیں۔ البتہ، اگر کوئی شخص کوئی دوا یا انجکشن استعمال ہی اس غرض سے کرتا ہے کہ اس کے بدن کو تقویت پہنچے اور کمزوری محسوس نہ ہو تو یہ روزے کے مقصد کے خلاف ہے، لہٰذا اس صورت میں روزہ ٹوٹ جائے گا، خواہ وہ رگ میں لگایا جائے یا گوشت میں۔

کیسٹ کو بے وضو چھونا

بعض علما کا خیال ہے کہ ایسی کیسٹ کو چھونے کے لیے بھی باوضو ہونا ضروری ہے جس میں قرآن مجید کی تلاوت ریکارڈ کی گئی ہو، کیونکہ وضو کے حکم کا مقصد قرآن کا احترام ہے اور احترام جیسے لکھے ہوئے قرآن کا ہونا چاہیے، اسی طرح ریکارڈ کیے ہوئے قرآن کا بھی ہونا چاہیے۔ ہمارے خیال میں ادب اور احترام کا تعلق انسان کی داخلی کیفیات سے ہے۔ چونکہ کیسٹ پر قرآن ظاہری طور پر لکھا ہوا نہیں ہوتا، اس لیے اس کو چھوتے ہوئے آدمی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ اس نے قرآن پکڑا ہوا ہے اور نہ وہ کوئی حجاب (Reluctance) محسوس کرتا ہے، چنانچہ اس صورت میں باوضو ہونے کی شرط لگانا درست نہیں ہے۔

ٹیپ ریکارڈر سے قرآن سننے پر سجدۂ تلاوت

علما کا خیال ہے کہ ٹیپ ریکارڈر سے تلاوت سننے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ سننے والا، خود پڑھنے والے کی زبان سے قرآن سنے۔ ہمارے نزدیک سجدۂ تلاوت کی حکمت یہ ہے کہ آدمی ایسی آیات کو سن کر جن میں سجدہ کی ترغیب دی گئی ہے، فوراً ان کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی عاجزی کا اظہار کرے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آیت کسی کی زبان سے سنی گئی ہے یا ٹیپ ریکارڈر سے، اس لیے ہمارے نزدیک دونوں صورتوں کا حکم ایک ہونا چاہیے۔

مصالح

مصالح کے عنوان کے تحت مختلف ذیلی اصول مندرج ہوتے ہیں:

۱۔ الدین یسر

پہلا اصول یہ ہے کہ مامورات میں، یعنی ایسی باتوں میں جن کا کرنا دین میں مطلوب ہے، حتی الوسع یسر اور آسانی کو ملحوظ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رکھا جائے۔ ہمارے نزدیک حسب ذیل مسائل میں اس اصول کا اطلاق ہونا چاہیے۔

وگ اور مصنوعی دانتوں کے ساتھ غسل

علما نے ایسے دانتوں میں جو مستقل طور پر لگا دیے گئے ہوں اور ایسے دانتوں میں جن کو اتارا جا سکے، فرق کرتے ہوئے دوسری صورت میں غسل میں دانتوں کے اتارنے کو ضروری قرار دیا ہے۔ اسی طرح سرجری کے بعض نئے طریقوں میں گنجے پن کے مریضوں کے سر پر ایک جھلی، جس پر بال لگے ہوتے ہیں، مستقل طور پر لگا دی جاتی ہے جو سر سے جدا نہیں ہو سکتی۔ علما نے اس طرح کی وگ کو بھی غسل سے مانع قرار دیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں فتوے یسر کے خلاف ہیں۔

ناخن پالش کے ساتھ وضو اور غسل

ناخن پالش کے بارے میں علما کا موقف یہ ہے کہ اس کے ساتھ وضو درست نہیں، کیونکہ اس کی تہہ (Layer) ناخنوں تک پانی کے پہنچنے سے مانع ہے۔ یہ موقف احتیاط پر مبنی ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک یسر کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جو جسم کے ساتھ اس طرح چپک جائے کہ اس کو الگ کرنے کے لیے رگڑنے یا کھرچنے کی ضرورت پڑے، اسے اصل جلد ہی کے حکم میں تصور کیا جائے۔ اس طرح ناخن پالش، پینٹ یا تارکول وغیرہ کے جسم پر لگنے کی صورت میں ان کو اتارے بغیر وضو اور غسل درست ہو گا۔

۲۔ الاصل الاباحۃ

دوسرا اصول یہ ہے کہ اجتہاد کے دائرے میں آنے والے امور میں اصل اباحت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل درست ہے، الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی ممانعت شریعت میں وارد ہوئی ہو۔ ایسے معاملات، بالعموم، کسی نہ کسی مصلحت یا منفعت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس اصول پر حسب ذیل امور جائز قرار پاتے ہیں:

اعضا کی پیوند کاری

علما کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ ایک انسان اپنا کوئی عضو اپنی زندگی میں یا موت کے بعد کسی دوسرے شخص کو نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کا جسم درحقیقت اللہ کی ملکیت ہے، اس لیے اسے اپنے جسم پر اس نوعیت کا تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ علما کے دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ اعضا کی منتقلی (Transplantation) سے انسانوں کا فائدہ متعلق ہے، کیونکہ اس طریقے سے کئی مریض مرض سے نجات پا لیتے ہیں اور بعض صورتوں میں ان کی زندگی بھی بچائی جا سکتی ہے، اس لیے یہ طریقہ درست ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دوسری رائے درست ہے۔

ٹیسٹ ٹیوب

ٹسٹ ٹیوب کی مدد سے بعض بے اولاد جوڑوں کے ہاں اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس طریقے سے فائدہ اٹھانا بالکل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جائز ہوگا، بشرطیکہ بچے کی تولید میں مادہ ایسے مرد و عورت ہی کا استعمال کیا جائے جو شرعی طور پر میاں بیوی ہیں۔

چٹ فنڈ یا کمیٹی

ہمارے معاشرے میں عام لوگوں نے سہولت کی غرض سے کمیٹی کے نام سے قرض کا ایک طریقہ رائج کیا ہے جس میں تمام شرکا ہر ماہ رقم کی ایک متعین مقدار ادا کرتے ہیں اور جمع شدہ رقم باری کے مطابق کسی ایک رکن کو دے دی جاتی ہے۔ اس طرح تمام شرکا اپنی اپنی باری پر اپنی رقم پوری کی پوری اکٹھی وصول کر لیتے ہیں۔ بعض اہل علم نے اگرچہ اس کو غلط قرار دیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک اس طریقے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ البتہ اس کا ایک دوسرا طریقہ جس میں شرکا کو اپنی ادا کردہ رقم سے کم یا زیادہ پیسے مل جاتے ہیں، صریحاً ناجائز ہے۔

ممسک حیض ادویہ

حج کے ایام میں تمام افعال حج کو اپنے مقرر وقت پر انجام دینے کے لیے اگر خواتین ایسی ادویہ استعمال کریں جو وقتی طور پر حیض کے خون کو روک دیں تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی خاتون محسوس کرے کہ رمضان کا مہینہ گزرنے کے بعد تنہا روزے رکھنا نفسیاتی طور پر مشکل ہوگا تو وہ رمضان ہی میں روزے رکھنے کے لیے ایسی ادویہ استعمال کر سکتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ الضرورات تبیح المحظورات

تیسرا اصول یہ ہے کہ شریعت کے حرام کردہ امور اضطرار کی حالت میں، ضرورت کے مطابق جائز قرار پاتے ہیں۔ اس کا اطلاق حسب ذیل صورتوں میں ہوتا ہے:

بینک کی ملازمت

بینک کی بنیاد چونکہ سودی کاروبار پر ہے، اس لیے حدیث کی رو سے اس میں کسی بھی درجے میں شرکت حرام ہے۔ تاہم اگر کسی شخص کے پاس اس کے علاوہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش نہ ہو جس سے اس کے روزمرہ اخراجات پورے ہو سکتے ہوں تو وہ متبادل ذریعۂ معاش میسر ہونے تک بینک کی ملازمت کر سکتا ہے۔

سودی قرض لینا

سود پر قرض دینا اور لینا، اصولی طور پر، دونوں حرام ہیں۔ تاہم اگر کوئی شخص اپنی روزمرہ ضروریات (خوراک اور لباس) پورا کرنے سے بھی عاجز ہو تو وہ ضرورتاً سود پر قرض لے سکتا ہے۔

ٹیکس اور سود میں سود کی ادائیگی

اگر کسی شخص کے پاس سود کی رقم کسی طریقے سے آ جائے تو وہ اسے اپنے کسی استعمال میں نہیں لا سکتا، اس کے لیے اس کو

اپنی ملک سے نکال دینا واجب ہے۔ البتہ، اگر اس پر کسی ایسے ٹیکس کی ادائیگی واجب ہو جو حکومت نے ناجائز طور پر عائد کیا ہے یا اس نے مجبوراً سود پر قرض لیا ہو تو وہ سود کی مد میں حاصل ہونے والی رقم کو ٹیکس اور سود کی ادائیگی میں استعمال کر سکتا ہے۔

پوسٹ مارٹم

انسانی جسم کی چیر پھاڑ ناجائز ہے۔ لیکن علاج یا دیگر ضرورتوں کے تحت اس کی اجازت ہے۔ طب جدید میں موت کی وجوہ اور اس طرح کے دیگر معاملات کی تفتیش کے لیے مردے کے جسم کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے۔ ضرورت کے اصول کے تحت یہ درست ہوگا۔

۴۔ المشقة تجلب التيسير

چوتھا اصول یہ ہے کہ شریعت نے بعض احکام میں جو شرائط و قیود لاگو کی ہیں، اگر کسی موقع پر ان کی پابندی کرنے سے حرج لاحق ہوتا ہو تو ان کی رعایت ضروری نہیں رہے گی۔ یہ اصول اس نوعیت کے امور پر منطبق ہوتا ہے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طویل الاوقات علاقوں میں روزہ

ایسے علاقے جہاں ایک طویل عرصہ تک مسلسل دن اور پھر رات کا سلسلہ رہتا ہے، روزے کے اوقات قریبی علاقوں کے اوقات کے مطابق طے کیے جائیں گے، کیونکہ اس قدر طویل عرصہ تک روزہ رکھنا ناممکن ہے۔

ٹرین، ہوائی جہاز وغیرہ میں نماز

نماز میں قیام کرنا اور قبلہ رخ ہونا لازم ہے۔ تاہم ٹرین، ہوائی جہاز یا بحری جہاز میں سفر کرتے ہوئے اگر قیام کرنے یا قبلہ رخ ہونے کا التزام کرنے (Observance) میں دقت ہو تو یہ شرائط ساقط ہو جائیں گی اور بیٹھ کر کسی بھی جانب منہ کر کے نماز پڑھنا جائز ہوگا۔

حالت حیض میں بیت اللہ کا طواف

بیت اللہ کے طواف کے لیے حیض و نفاس اور جنابت سے پاک ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اگر ایام حج میں عورت کو حیض آ جائے تو وہ پاک ہونے کے بعد ہی طواف زیارت کر سکتی ہے۔ لیکن آج کل اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ حکومت سعودیہ کی طرف سے حاجیوں کو مخصوص دنوں کا ویزا جاری کیا جاتا ہے اور ان کی واپسی کی تاریخ کئی دن پہلے سے مقرر ہو چکی ہوتی ہے، اس لیے عورتوں کے لیے حیض سے پاک ہونے کا انتظار کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس صورت میں فقہا نے اجازت دی ہے کہ عورت ناپاکی کی حالت ہی میں طواف زیارت کر سکتی ہے۔ البتہ، اسے کفارے کے طور پر، جانور قربان کرنا ہوگا۔

حالت حیض میں تلاوت قرآن

حیض کی حالت میں عورت کے لیے قرآن کا پڑھنا ناجائز ہے۔ لیکن اگر کوئی عورت کسی مکتب میں معلّمہ یا طالبہ ہو تو ظاہر ہے کہ زیادہ دنوں تک چھٹی کرنے سے تعلیمی سرگرمیوں میں حرج واقع ہوتا ہے، لہٰذا ایسی خواتین کے لیے حالت حیض میں قرآن کا پڑھنا پڑھانا جائز ہوگا۔ البتہ، فقہا مزید احتیاط کے طور پر یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ وہ بیک دفعہ پوری آیت کی تلاوت کرنے کے بجائے ایک ایک کلمہ کی ادائیگی کرے۔

۵۔ ما ادی الی المحظور فھو محظور

اس اصول کا دوسرا نام سد ذرائع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے امور جو کسی ممنوع کام کا ذریعہ بنتے ہوں، ناجائز ہیں۔

جدید مسائل میں اس کی نظیر مانع حمل ادویہ اور آلات کی عام فراہمی ہے۔ علما نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ معاشرے کو زنا سے محفوظ رکھنے کے لیے داخلی پاکیزگی کی تربیت کے ساتھ ساتھ خارجی موانع (External Preventives) بھی برقرار رہنے چاہییں اور شریعت نے اسی غرض سے پردہ وغیرہ کے احکام دیے ہیں۔ زنا کے بارے میں انسانی جبلت اور معاشرتی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں اصل مانع کی حیثیت بدنامی کے خوف کو حاصل ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس مانع کو معاشرے میں برقرار رکھا جائے، ورنہ زنا پر کنٹرول ناممکن ہو جائے گا۔ مانع حمل ادویہ اور آلات کی سر عام فراہمی نے خود ہمارے معاشرے میں بھی، جہاں اعتقادی طور پر زنا کو حرام سمجھا جاتا ہے، اس خوف کو ختم کر دیا ہے اور زنا پہلے کی نسبت کہیں زیادہ عام ہو گیا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مانع حمل ادویہ اور آلات (Contraceptives) کی فراہمی کو محدود کیا جائے اور شادی شدہ جوڑوں کے علاوہ دوسروں کو اس کی فراہمی پر پابندی عائد کی جائے۔

۶۔ یختار اھون الشرین

اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی صورت حال میں دو ایسے راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ضرر یا مفسدہ کو مستلزم ہے تو کم مفاسد والے راستے کو اختیار کیا جائے گا۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

ظلم کے نظام میں شرکت

کسی ایسے اسلامی یا غیر اسلامی ملک میں جہاں ظلم کا نظام ہو، کاروبار حکومت میں شریک ہونے کی صورت میں ظاہر ہے، آدمی کو بہت سے ناجائز کام کرنے پڑیں گے، چاہے وہ دل سے ان کے کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ یہی صورت ہمارے معاشرے میں تجارت کی ہے۔ لیکن اگر ان میدانوں میں شرکت کو نیک لوگوں کے لیے بالکل ممنوع قرار دیا جائے تو یقیناً زیادہ بڑے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مفاسد پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ حکمت کا تقاضا ہے کہ ایسے لوگوں کو ان میدانوں میں آنے کی نہ صرف اجازت، بلکہ ترغیب دی جائے جو طبعاً برائی کو ناپسند کرتے ہوں اور اس کو مجبوری کے دائرے میں رکھتے ہوئے باقی امور میں ملک وقوم کی خدمت انجام دے سکیں۔

جڑواں بہنوں کا نکاح

اگر دو عورتیں اس طرح پیدا ہوئی ہوں کہ ان کے اعضا ایک دوسرے کے ساتھ ناقابل انفصال طریقے پر (Inseparably) جڑے ہوئے ہوں تو ان کے نکاح کا کیا حکم ہے؟ عقلاً اس میں تین احتمال ہیں: یا تو وہ دونوں مجرد رہیں، یا دونوں کا نکاح دو الگ الگ مردوں سے کر دیا جائے، اور یا دونوں کو ایک ہی مرد کے نکاح میں دے دیا جائے۔ ان میں سے پہلی صورت میں پایا جانے والا ضرر دوسری دو صورتوں میں پائے جانے والی قباحتوں کی بہ نسبت کہیں کم ہے، اس لیے ہمارے نزدیک اسی کو اختیار کیا جائے گا۔

عرف

قانون سازی میں معاشرے کے عرف ورواج (Customs) کی اہمیت دنیا کے تمام قدیم وجدید قوانین میں مسلم ہے اور فقہ اسلامی میں بھی اسے ایک مستقل ماخذ قانون کی حیثیت دی گئی ہے۔

عرف کے ضمن میں پہلا ضابطہ یہ ہے کہ اگر وہ نصوص شریعت اور اس کے مزاج کے خلاف نہ ہو تو معتبر ہوگا۔ ہر معاشرہ اپنی ضروریات اور حالات کے لحاظ سے افراد معاشرہ کے حقوق کی حفاظت اور معاملات کو بسہولت انجام دینے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس نوعیت کے تمام احکام اسلامی فقہ میں حجت مانے جاتے ہیں، بشرطیکہ وہ شریعت کے طے کردہ حدود ومقاصد سے ٹکراتے نہ ہوں۔

اس کی ایک مثال حقوق کی وہ قسم ہے جسے فقہا حقوق عرفیہ کا نام دیتے ہیں۔ اس سے مراد ایسے حقوق جو نص سے ثابت نہیں، لیکن کسی خاص عرف یا ماحول میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے ثبوت کا مدار عرف پر ہے، اس لیے زمان ومکان کے اختلاف سے یہ مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ حقوق عرفیہ کی چند نئی صورتیں جو ہمارے زمانے میں رائج ہیں اور جنھیں اہل علم نے تسلیم کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

پگڑی

کرایہ داری کے مروج طریقوں میں جائیداد کا مالک کرایہ دار سے کرایہ کی رقم کے علاوہ ایک متعین رقم پگڑی کے نام پر الگ سے وصول کرتا ہے جس کا مقصد کرایہ دار کی جانب سے جائیداد کی حفاظت اور بروقت جگہ خالی کرنے کی ضمانت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ علما نے اس صورت کو درست تسلیم کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حق تالیف وایجاد وحق طباعت

جدید قوانین میں کسی کتاب کے مصنف یا ناشر کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ ان سے اجازت لیے بغیر یا ان سے معاہدہ کیے بغیر کوئی دوسرا شخص یا ادارہ اس کتاب کو شائع نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بعض مخصوص ایجادات کے موجدین کی اجازت کے بغیر ان کی تیاری اور فروخت نہیں کی جا سکتی۔

رجسٹرڈ نام اور ٹریڈ مارک

کمپنیاں مختلف کاروباری فوائد کی خاطر مخصوص نام اور ٹریڈ مارک رجسٹرڈ کرا کے اپنی مصنوعات کی تشہیر کرتی ہیں اور اس طرح صارفین میں اس نام کی ایک شہرت (Reputation) بن جاتی ہے۔ جدید قوانین کی رو سے کسی دوسری کمپنی کو اس نام یا ٹریڈ مارک کے ساتھ مصنوعات بنانے یا بیچنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس سے اصل کمپنی کو کاروباری لحاظ سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور لوگوں کے ساتھ بھی دھوکا ہوتا ہے۔

دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ عرف اگر نصوص شریعت یا اس کے مزاج کے خلاف ہو تو معتبر نہیں ہوگا۔ چنانچہ جدید دور میں سود، جوئے اور دیگر شرعی محرمات کی تمام صورتوں کو اہل علم نے بالاتفاق حرام قرار دیا ہے، اگرچہ وہ معاشرے میں بہت عام ہو گئی ہیں۔

تیسرا ضابطہ یہ ہے کہ عرف اگر قیاس خفی کے معارض ہو تو عرف کو ترجیح ہوگی۔

اس کی ایک مثال تعطیلات کی اجرت ہے۔ قیاس کی رو سے تو آدمی کو صرف ان دنوں کی اجرت لینی چاہیے جن میں اس نے خدمت انجام دی ہے، لیکن چونکہ بالعموم اداروں، محکموں اور کمپنیوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ ملازمین کو تعطیلات کی اجرت بھی دی جاتی ہے، اس لیے یہ طریقہ درست مانا گیا ہے۔

اسی طرح ہمارے ملک میں یہ طریقہ رائج ہے کہ پرنٹنگ پریس چند نسخوں سے لے کر ایک ہزار یا گیارہ سو تک نسخوں کی اشاعت کا ایک ہی معاوضہ وصول کرتا ہے۔ بظاہر دس یا بیس نسخوں اور ایک ہزار نسخوں میں بڑا تفاوت ہے اور از روے قیاس طباعت کے معاوضے میں بھی فرق ہونا چاہیے، لیکن چونکہ یہ طریقہ عام رائج ہے اور عرفاً اس کو تسلیم کیا جاتا ہے، لہٰذا قیاس ناقابل التفات ہوگا۔

چوتھا ضابطہ یہ ہے کہ عرف کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔

مثلاً کرنسی نوٹ جب نیا نیا متعارف ہوا تو اس وقت عرف کے لحاظ سے اس کی حیثیت ایک وثیقہ اور ضمانت کی تھی، چنانچہ علما نے اس کے لین دین پر وثیقہ کے فقہی احکام جاری کرتے ہوئے فتویٰ دیا تھا کہ ان سے زکوٰۃ یا قرض وغیرہ اس وقت تک ادا نہیں ہوں گے، جب تک کہ صاحب حق بینک سے اصل زر وصول نہ کر لے۔ لیکن اب نوٹ کی حیثیت عرفی ثمن کی ہے اور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کوئی شخص ان کو وثیقہ یا اصل رقم کی ضمانت نہیں سمجھتا، لہٰذا ان اس پر عرفی ثمن کے احکام جاری ہوں گے اور ان کے ادا کرنے سے قرض، زکوٰۃ اور دوسری ادائیگیاں، حقیقی ادائیگیاں سمجھی جائیں گی۔

انسانی علم کے ارتقا نے جو نئی سہولیات مہیا کی ہیں، ان سے استفادہ بھی، ہمارے نزدیک اسی ضمن میں آتا ہے۔ چنانچہ رویت ہلال میں جدید سائنسی آلات سے، جرائم کی تفتیش میں تربیت یافتہ کتوں اور انگلیوں کے نشانات (Finger Prints) سے، اور قتل و زنا کے مقدمات کی تحقیق میں پوسٹ مارٹم، ڈی این اے ٹیسٹ اور طبی معائنے کی دوسری صورتوں سے مدد لینا اور ان پر اعتماد کرنا بالکل درست ہوگا۔

اس جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی فقہ نئے پیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے ایک جامع، مربوط اور منضبط (Coherent) ضابطہ رکھتی ہے۔ اس ضمن میں فقہا کے وضع کردہ قواعد مضبوط علمی و عقلی اساسات پر مبنی ہیں اور چند جزوی اختلافات سے قطع نظر، فقہا کے مابین ہمیشہ مسلم رہے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد خود قرآن مجید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور فقہا صحابہ کے اجتہادات میں موجود ہے۔ ان قواعد کی جامعیت عقلی استقرا کے لحاظ سے بھی بالکل قطعی ہے اور ان چودہ صدیوں میں ان کے عملی استعمال نے بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ قیامت تک انسانی زندگی کو پیش آنے والے ہر نشیب و فراز کا سامنا کرنے اور ہر قسم کے مسائل کے حوالے سے دین کا منشا متعین کرنے کے لیے کافی و شافی ہیں۔

ہٰذا ما عندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد صدیق شاہ بخاری

اسبال ازار

—۱—

اسبال ازار کے مسئلے کو ہمارے مذہبی حلقوں میں نہ صرف یہ کہ ایک دینی حکم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، بلکہ کسی مسلمان کے دین دار ہونے کی علامت کے طور پر بھی مانا جاتا ہے۔ چونکہ اس مسئلے کو دین اور دین داری، بلکہ حرام و ناجائز کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسے اس کے بنیادی ماخذ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے اور وہ بنیادی ماخذ چونکہ احادیث ہی ہیں، اس لیے ہم اس مسئلے کو احادیث ہی سے حل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

اسبالِ ازار کے بارے میں بنیادی اور موضوع سے براہِ راست متعلق احادیث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مضمون اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ان میں کسی قدر تنوع پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہم انھیں حسبِ ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ حکم کا اجمالاً بیان

۲۔ حکم کا صراحت سے بیان

۳۔ حکم کی علت کا بیان

۴۔ اشتراکِ علت کا بیان

۵۔ استثنا کا بیان

۱۔ حکم کا اجمالاً بیان

اس ضمن میں دو احادیث نقل ہوئی ہیں:

۱۔ ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تہبند کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا، وہ (حصہ) جہنم میں ہوگا۔'' (بخاری، رقم ۵۳۴۱)

۲۔ ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: تین قسم کے لوگ ہیں جن سے اللہ روزِ قیامت نہ تو بات کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا، نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی۔ حضرت ابوذر نے کہا: وہ تو ناکام و نامراد ہوگئے۔ یہ کون ہیں اے اللہ کے رسول؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ازار کو لٹکانے والا، احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر مال بیچنے والا۔''
(مسلم، رقم ۱۵۴)

ان احادیث سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- ازار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا جہنم میں ہوگا۔
- ایسے آدمی سے اللہ نہ روزِ قیامت بات کرے گا، نہ نظر رحمت سے دیکھے گا اور نہ اسے پاک کرے گا۔
- دوسری حدیث میں آپ نے تاکید اور مسئلہ کی اہمیت واضح کرنے کے لیے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی۔
- ازار لٹکانے والا، احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر مال بیچنے والا، ان تینوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی زمرے میں رکھا ہے۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ ان تینوں جرائم میں مخفی علت ایک ہی ہے، اس لیے غالباً آپ نے ان تینوں کو یکجا کر دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔ حکم کا صراحت سے بیان

بعض احادیث وہ ہیں جن میں اسبالِ ازار کے ضمن میں کچھ دیگر تفصیلات پائی جاتی ہیں:

۱۔ ''حضرت ابن عمر فرماتے ہیں: میرا گزر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ہوا اور میری حالت یہ تھی کہ میرا تہبند (ٹخنوں سے) نیچے لٹک رہا تھا۔ تو آپ نے فرمایا اے عبداللہ اپنا تہبند اوپر کر۔ میں نے اوپر کر لیا۔ پھر آپ نے فرمایا: اور زیادہ کر۔ میں نے اور زیادہ اوپر کر لیا۔ اس کے بعد سے میں ہمیشہ اس کا خیال رکھتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا: تہبند کہاں تک ہونا چاہیے؟ تو آپ نے فرمایا: نصف پنڈلی تک۔'' (مسلم، رقم ۳۸۹۲)

۲۔ ''حضرت حذیفہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری پنڈلی کے پٹھے سے یا اپنی پنڈلی کے پٹھے سے پکڑا اور فرمایا: یہ تہبند کی جگہ ہے۔ اگر تو مزید چاہے تو تھوڑا اور نیچے کر لے، اگر مزید چاہے تو ٹخنوں سے نیچے ہرگز نہیں۔''
(ترمذی، رقم ۱۷۰۵)

۳۔ ''ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے نماز میں تکبر کی وجہ سے تہبند نیچے لٹکایا، اس کا اسلام سے کیا تعلق؟'' (ابوداؤد، رقم ۵۴۲)

۴۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں کپڑا لٹکانے سے منع فرمایا ہے۔''
(ترمذی، رقم ۳۴۵)

۵۔ ''حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسے فرمایا جاؤ وضو کرو۔ وہ گیا اس نے وضو کیا۔ پھر (ٹخنوں سے نیچے تہبند لٹکا تا ہوا) آیا تو آپ نے فرمایا: جاؤ وضو کرو۔ وہ دوبارہ گیا۔ وضو کیا۔ پھر ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول کیا وجہ ہے کہ آپ نے ایک باوضو انسان کو دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا؟ آپ نے فرمایا: وہ تہبند لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں کرتا۔''

(ابوداؤد، رقم ۵۴۳)

۶۔ ''حضرت ابوسعید خدری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مسلمان کی تہبند نصف پنڈلی تک ہوتی ہے۔ اور اگر پنڈلی سے لے کر ٹخنوں تک ہو تب بھی کوئی حرج نہیں۔ مگر جو ٹخنوں سے بھی نیچے لٹکائے گا تو وہ آگ میں ہوگا۔ جس نے اپنے تہبند کو تکبر کی وجہ سے گھسیٹا، اللہ اس کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔''

(ابوداؤد، رقم ۳۵۷۰)

۷۔ ''حضرت عمرو بن زرارہ انصاری کہتے ہیں کہ وہ چل رہے تھے اور تہبند ٹخنوں سے نیچے تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملے تو آپ اپنی پیشانی مبارک پکڑ کر فرما رہے تھے: اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے اور باندی کا بیٹا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے عمرو۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول میں پتلی پنڈلیوں والا آدمی ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو، بے شک اللہ نے ہر چیز کی تخلیق خوب صورت انداز میں کی ہے۔ آپ نے اپنی داہنی ہتھیلی کی چار انگلیاں حضرت عمرو کے گھٹنے کے نیچے رکھ کر فرمایا: اے عمرو یہ تہبند رکھنے کی جگہ ہے۔ پھر آپ نے وہاں سے ہتھیلی مبارک اٹھائی اور ان کے دوسرے گھٹنے کے نیچے رکھی اور فرمایا: اے عمرو یہ تہبند رکھنے کی جگہ ہے۔'' (مسند احمد، رقم ۱۷۱۱۴)

۸۔ ''ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امہات المومنین نے آپ سے قمیض کے دامن کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا: اسے (مردوں کی نسبت سے) ایک بالشت زیادہ کرلو۔ انھوں نے کہا کہ ایک بالشت زیادہ کرنے سے تو پوری ٹانگیں چھپتی نہیں تو آپ نے فرمایا: ایک ذراع کرلو۔ تو جب بھی ان میں سے کوئی اپنی قمیض بنانا چاہتیں تو اسے ایک ذراع لٹکا لیتیں اور اسے دامن بنالیتیں۔'' (مسند احمد، رقم ۵۳۷۹)

۹۔ ''حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ یا حضرت امِ سلمیٰ کو حکم دیا کہ وہ اپنا دامن ایک ذراع بنائیں۔'' (مسند احمد، رقم ۹۰۱۵)

احادیث کے اس حصے سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

- تہبند اصلاً نصف پنڈلی تک ہونا چاہیے۔
- ٹخنوں تک رکھنے میں بھی کوئی گناہ نہیں۔
- نماز میں کپڑا لٹکانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ (اس حدیث کے ضمن میں بعض علما نے کہا ہے کہ یہ اس لیے منع ہے کہ یہ یہود کی عادت تھی)۔
- نماز میں تکبر کی وجہ سے کپڑا لٹکانے والے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ (یہود کی مشابہت پر غور کریں تو یہ اسلوب

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

واضح ہو جاتا ہے)۔

o اللہ تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں کرتا، بلکہ اسے وضو بھی دوبارہ کرنا چاہیے۔ (تکبر کی علت اور یہود کی مشابہت ذہن میں رکھیں تو شناعت واضح ہو جاتی ہے)۔

o جس نے تہبند کو تکبر کی وجہ سے گھسیٹا، اللہ اس کی طرف نظر رحمت نہ کرے گا۔

o مسلمان کی تہبند تو نصف پنڈلی تک ہوتی ہے۔ (حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں مسلمان کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اسے یہود کے بالمقابل رکھ کر دیکھیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے)۔

o آپ نے باقاعدہ ہاتھ سے واضح فرمایا کہ یہ تہبند کی جگہ ہے۔

o عورتوں کی قمیض کا دامن مردوں کی نسبت ایک ذراع لمبا ہونا چاہیے تاکہ پوری ٹانگیں چھپ جائیں۔

۳۔ حکم کی علت کا بیان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

علت بیان کرنے والی احادیث درجِ ذیل ہیں:

۱۔ ''ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس کی طرف (نظر رحمت سے) دیکھے گا بھی نہیں جس نے تکبر کی وجہ سے کپڑا گھسیٹا۔ (یعنی اتنا لٹکایا کہ گھسٹتا چلا گیا)۔'' (مسلم، رقم ۳۸۸۷)

۲۔ ''ابنِ عمر نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنا تہبند نیچے گھسیٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ میں نے اپنے ان دونوں کانوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ جس نے اپنا تہبند نیچے لٹکایا اور اس لٹکانے سے اس کا ارادہ محض تکبر ہی ہو تو اللہ اس کی طرف روزِ قیامت دیکھے گا بھی نہیں۔'' (مسلم، رقم ۳۸۹۰)

۳۔ ''ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے لوگوں میں ایک آدمی تھا جو تکبر کی وجہ سے اپنا تہبند گھسیٹ کر چلتا تھا، وہ اس کی وجہ سے زمین میں دھنسا دیا گیا، تا قیامت زمین میں دھنستا ہی چلا جائے گا۔''
(مسلم، رقم ۳۸۹۵)

۴۔ ''حبیب کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ جس نے اپنے تہبند کو تکبر سے روندا (گھسیٹا) وہ جہنم میں گھسیٹا جائے گا۔'' (مسند احمد، رقم ۱۷۳۸۳)

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اسبالِ ازار پر جو وعید ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو تکبر کی وجہ سے کپڑے نیچے لٹکائیں۔

۴۔ اشتراکِ علت کا بیان

ازار کے علاوہ بھی کچھ کپڑے ایسے ہیں جو اشتراکِ علت کی بنا پر اسبالِ ازار کی وعید کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔

۱۔ ''سالم بن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسبال تہبند میں بھی ہے، قمیض

میں بھی اور عمامہ میں بھی، جس نے ان میں سے کسی کو بھی تکبر سے لٹکایا، اللہ روزِ قیامت اس کی طرف (نظر رحمت سے) نہ دیکھے گا۔'' (ابوداؤد، رقم ۴۰۹۴)

۲۔ ''ابنِ عمر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے کپڑے کو تکبر کی بنا پر گھسیٹا (لٹکایا)، اللہ اس کی طرف نظر نہ کرے گا۔ ام سلمہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول، عورتیں اپنی (قمیض کے) دامن کیسے بنائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ (مردوں کی نسبت سے) ایک بالشت (زیادہ) لٹکالیں۔ ام سلمہ نے پوچھا اگر پھر بھی قدم کھلے رہیں تو آپ نے فرمایا: ایک ذراع کرلیں، مگر اس سے زیادہ نہیں۔'' (نسائی، رقم ۵۲۴۱)

۳۔ ''ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اسبال تہبند میں بھی ہے، قمیض میں بھی اور عمامہ میں بھی۔ جس نے ان میں سے کچھ بھی لٹکایا، اللہ اس پر روزِ قیامت (رحمت کی نظر) نہ کرے گا۔'' (نسائی، رقم ۵۲۳۹)

۴۔ ''ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو مجھ پر بڑی نئی اور چمک دار چادر تھی۔ حضور نے پوچھا: یہ کون ہے؟ میں نے کہا میں عبداللہ ہوں۔ آپ نے فرمایا: اگر تو عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ ہے تو اپنی تہبند کو اونچا کرلو۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے اونچا کرلیا۔ آپ نے فرمایا: اور زیادہ کرو۔ میں نے پھر اونچا کیا یہاں تک کہ نصف پنڈلی تک پہنچ گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا جس نے اپنا کپڑا تکبر کی وجہ سے لٹکایا، اللہ اس کی طرف روزِ قیامت نظر بھی نہ کرے گا۔ ابوبکر کہتے ہیں: میرا ازار تو کبھی لٹک جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو (یعنی ابوبکر) ان (متکبرین) میں سے نہیں۔'' (مسند احمد، رقم ۶۰۵۶)

۵۔ ''خریم اسدی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کہا: اے خریم تو کتنا ہی اچھا آدمی ہے اگر تم میں دو خصلتیں نہ ہوں۔ میں نے پوچھا، وہ کون سی اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا: تیرا تہبند کا لٹکانا اور بالوں کا کھلا چھوڑنا۔''

(مسند احمد، رقم ۱۸۱۴۳)

ان احادیث سے مندرجہ ذیل نکات معلوم ہوتے ہیں:

o اسبال صرف تہبند کے ساتھ مخصوص نہیں، دیگر کپڑوں مثلاً عمامہ، قمیض وغیرہ میں بھی ہوسکتا ہے، اور اگر وہاں بھی تکبر پیش نظر ہو تو یہی وعید ان کپڑوں کے لیے بھی ہے۔ اسی طرح بالوں کا کھلا چھوڑنا بھی ناپسندیدہ کہا گیا ہے۔

o خواتین کو اپنے دامن لمبے رکھنے چاہییں تاکہ ٹانگوں میں سے کچھ حصہ بھی نمایاں نہ ہو۔

o اللہ کے بندے تکبر کی وجہ سے کپڑا نہیں لٹکاتے۔ کوئی چاہے کہ وہ اللہ کا بندہ نظر آئے (یعنی عاجزی ظاہر ہو) تو وہ مکتبرانہ ہیئت اختیار نہ کرے۔

o جس کا ازار تکبر کی وجہ سے نہیں، بلکہ ویسے ہی لٹک جاتا ہو، وہ متکبر لوگوں میں سے نہیں۔

۵۔ استثنا کا بیان

''سالم، عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنا کپڑا تکبر کی وجہ سے لٹکایا اللہ اس

کی طرف روزِ قیامت دیکھے گا بھی نہیں۔ ابوبکر نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، میرے تہبند کا ایک جانب تو لٹک ہی جاتا ہے، جب تک میں اسے مضبوط باندھ کر نہ رکھوں۔ حضور نے فرمایا: تو ان میں سے نہیں جو تکبر سے ایسا کرتے ہیں۔''

(مسند احمد، رقم ۵۵۵۳)

اسی طرح کی روایت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ہے۔ اس میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو یہی ارشاد فرمایا۔

مطلب یہ ہوا کہ اس مسئلہ میں استثنا یہی ہے کہ جو تکبر کی وجہ سے ایسا نہ کرے، وہ اس وعید میں شامل نہ ہوگا۔

احادیث کے ان تمام حصوں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ بعض جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اجمالی طور پر روایت ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً جو بھی اسبالِ ازار کرے گا، وہ جہنم میں جائے گا۔

۲۔ یہی بات بعض احادیث میں تفصیل سے آئی تو اس سے کچھ اور چیزیں بھی سامنے آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ نماز میں یہ ہیئت منع ہے۔ اس ممانعت کی وجہ یہود سے مشابہت ہے اور تکبر کی علت ہے۔

۳۔ پھر بعض احادیث میں واضح طور پر اس حکم کی علت بیان ہوئی ہے کہ چونکہ یہ متکبرانہ ہیئت ہے، اس لیے منع ہے اور جو تکبر و غرور کی بنا پر ایسا کرے گا، اس کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ علت بیان کرنے والی ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی حکم کے اندر جو عموم محسوس ہوتا ہے، وہ ان احادیث کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے۔ امام نووی بھی یہی بات فرماتے ہیں:

''ان (احادیث) کے عموم کو ان احادیث کے ساتھ خاص کر دیا جائے گا، جن میں خیلا (تکبر) کا ذکر ہے۔ یعنی یہ وعید اس شخص کے لیے ہوگی جو از روے تکبر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔''

(شرح نووی، بحوالہ ''حرمین'' مارچ، اپریل ۲۰۰۰)

پھر بعض دیگر کپڑوں مثلاً عمامہ، قمیض، چادر وغیرہ میں بھی اگر متکبرانہ ہیئت اختیار کی جائے تو انھیں بھی اسبالِ ازار کی وعید میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ شمول بھی احادیث کے عموم کو علت سے خاص کرنے پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا استثنا بھی اس علت کو اور موکد کرتا ہے۔

مسند احمد، نسائی اور ابن ماجہ میں بیان کردہ درج ذیل حدیث بھی نفسِ مسئلہ کو اور علت کو بالکل عیاں کر دیتی ہے:

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم كلوا واشربوا و تصدقوا

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اجازت ہے کہ خوب کھاؤ، پیو، دوسروں پر صدقہ کرو اور لباس پہنو (جیسا چاہو)، بشرطیکہ اسراف اور نیت میں فخر و

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

والبسوا ما لم یخالط اسراف ولا مخیلة۔ (مسند احمد، سنن نسائی، ابن ماجہ، بحوالہ معارف الحدیث، ۶/ ۲۹۷)

استکبار نہ ہو۔‘‘

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول بھی صحیح بخاری میں نقل کیا ہے:

کل ما شئت والتبس ما شئت ما اخطا تك اثنتان سرف و مخیلة۔ (معارف الحدیث ۶/ ۲۹۸)

’’جو بھی جی چاہے کھاؤ اور جو جی چاہے پہنو (جائز ہے)۔ جب تک دو باتیں نہ ہوں، ایک اسراف اور دوسرے استکبار و تفاخر۔‘‘

(جاری)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

اسلام اور مغرب ـــــ ۱۱ ستمبر کے بعد

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد ہم ایک نئی دنیا میں زندہ ہیں۔ ایسی دنیا جس میں انسانوں کے خیالات، زاویۂ نگاہ، اندازِ حیات، ہر چیز پہلے سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر مغرب میں بسنے والا انسان یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ ایک آزاد جمہوری سرمایہ دارانہ معاشرے (Liberal Democratic Capitalist Society) کے قیام کے بعد ہم ایک ایسی معاشرت کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جسے مزید ارتقا کا کوئی مرحلہ درپیش نہیں ہے۔ جو لوگ اس تصور پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے، اب یقیناً کسی دوسرے زاویے سے سوچ رہے ہیں۔ اسی طرح پروفیسر ہنٹنگٹن نے جب تہذیبوں کے تصادم کی پیش گوئی کی تھی تو جہاں یہ ایک عالم گیر معاشرت (Globalization) کے تصور کی نفی تھی، وہاں اس بات کا بھی اعلان تھا کہ آنے والے دنوں میں مسابقت کا اصل میدان تہذیبی اقدار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ۱۱ ستمبر کے بعد مقابلے کا یہ میدان بدل چکا ہے۔ ریاست کو درپیش مسائل کے باب میں بھی، جو رائے پہلے تھی، اب نہیں رہی۔ یہ کب کسی نے سوچا تھا کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب دہشت گردی ایک ریاست کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار پائے گی۔ چند افراد کا خوف ایک عظیم الشان مملکت پر آسیب کی طرح چھا جائے گا۔

''اسلام اور مغرب'' بھی یقیناً ایک ایسا موضوع ہے جس پر غور و فکر کا اسلوب اب بدل رہا ہے۔ یہ موضوع اس سے قبل بھی زیرِ بحث تھا، لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد اس کی نوعیت وہ نہیں رہی۔ اس میں بعض نئی جہتیں (Dimensions) شامل ہو گئی ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ ایسا ہے، جو مستقبل میں عالمی معاشرت کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک اب یہ ہم پر بھی لازم ہو گیا ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ سوچ بچار کیا جائے اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے کوئی ایسا نقطۂ نظر اختیار کریں جو ایک طرف بہتر اور پرامن مستقبل کی بشارت ہو اور دوسری طرف مسلمانوں کے لیے ترقی اور بقا کے زیادہ سے زیادہ امکانات لیے ہوئے ہو۔ اس حوالے سے دو امور بطور خاص ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ ایک تو مغرب کے بارے میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

درست معلومات اور دوسرا معاصر اسلامی فکر کا جائزہ جسے آج مسلمانوں کی مجموعی سوچ قرار دیا جا رہا ہے۔

اس واقعے کے بعد ابتداءً مغرب میں جس رائے کا غلبہ رہا، وہ بحیثیت مجموعی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایک منفی تاثر پر مبنی تھی۔ اس رائے کو دو وجوہات سے تقویت پہنچی۔ ایک تو اس کا سبب وہ موقف ہے جو اسامہ بن لادن اور ان سے وابستہ لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ وہ علانیہ طور پر خود کو امریکہ کے ساتھ حالت جنگ میں قرار دے رہے تھے اور امریکہ کی نظر میں اسامہ سب سے زیادہ مطلوب آدمی (The Most Wanted Person) تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دھماکوں کے بعد سب سے زیادہ شک انھی پر ہونا تھا۔ پھر اس کے ساتھ مختلف مقامات پر مسلمانوں کے وہ مظاہرے تھے، جو اسامہ کے حق میں ہو رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مغربی ذرائع ابلاغ اسامہ بن لادن کو پوری مسلمان قوم کا نمائندہ بنا کر پیش کر رہے تھے اور اس تاثر کو گہرا کرنے کی شعوری کوشش میں مصروف تھے کہ اسلام ایک جنگ جو مزاج کا مذہب ہے اور اس کے ماننے والوں سے انسانی تہذیب کو خطرات درپیش ہیں۔ اس باب میں ان کے ذرائع ابلاغ نے بنیادی اخلاقیات کو جس طرح پامال کیا، حقیقت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے چہرے پر ایک بدنما داغ کے طور پر ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ مثال کے طور پر ان دھماکوں کے بعد سی این این نے کئی مرتبہ ایک فلم دکھائی جس میں فلسطینی مسلمان ان واقعات پر اظہار مسرت کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کسی کے گھر میں صف ماتم بچھی ہو اور اس پر کوئی خوشی کا اظہار کرے تو اس کا لازمی نتیجہ نفرت کا وہ جذبہ ہے جو متاثرہ قوم کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ بات متحقق ہوگئی ہے کہ یہ فلم ۱۹۹۱ء میں بنی تھی جب تل ابیب پر عراق کے میزائل گر رہے تھے۔ فلسطینی اس واقعے پر خوشی منا رہے تھے، لیکن سی این این جیسا عالمی شہرت یافتہ ادارہ اسے ۱۱ ستمبر کے دھماکوں کے تناظر میں دکھا رہا تھا۔ اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا کہ امریکیوں میں فلسطین کے مسلمانوں کے بارے میں نفرت پیدا کی جائے اور اسرائیل کے لیے ہمدردی میں اضافہ کیا جائے۔ ان ذرائع ابلاغ کی اس جارحانہ مہم نے بھی عام لوگوں پر اثر ڈالا۔ امریکہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہاں ایک عام آدمی عالمی سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتا۔ بہت سے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ دنیا کے نقشے پر افغانستان یا پاکستان نام کے ممالک بھی موجود ہیں۔ ان کے اذہان کو متاثر کرنے میں ان ذرائع ابلاغ نے بنیادی کردار ادا کیا جو رائے سازی کا آج سب سے موثر ذریعہ ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان دو وجوہات کی بنیاد پر ابتدا میں اہل مغرب کی نفرت اور ناپسندیدگی کا نشانہ تنہا مسلمان ہی بنے۔ ایک طرف امریکہ اور بعض دوسری جگہوں پر ایسے افسوس ناک واقعات ہوئے جن میں عام مسلمانوں کو اہل مغرب کی ناراضی کا شکار ہونا پڑا اور دوسری طرف صدر بش جیسے آدمی نے بھی غیر محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے ان واقعات کو نئی صلیبی جنگوں کا نقطۂ آغاز قرار دے دیا۔ اگرچہ جلد ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور انھوں نے اس پر معذرت کر لی۔ اس سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ذرائع ابلاغ نے کیسے لوگوں کے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ تاہم یہ دورانیہ کچھ ایسا طویل نہیں رہا۔ جیسے ہی جذبات کی شدت میں کمی آئی لوگوں نے ان واقعات کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک طرف اس رائے کا اظہار ہونے

لگا کہ ان واقعات کا ذمہ دار تنہا اسامہ بن لادن کو قرار دینا اس وقت تک درست نہیں ہوگا جب تک آپ کے پاس ٹھوس شواہد موجود نہ ہوں۔ لہٰذا دوسرے عوامل پر بھی غور کرنا چاہیے اور اس پہلو سے بھی سوچنا چاہیے کہ ان دھماکوں میں کوئی دوسرا گروہ بھی ملوث ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف یہ رائے بھی سامنے آنے لگی کہ اسامہ بن لادن کو پوری ملت اسلامیہ کا تنہا ترجمان قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس بات پر غور ہونا چاہیے کہ وہ جو موقف پیش کر رہے ہیں، کیا اسلام کے ماخذ اس کی تائید کرتے ہیں اور کیا مسلمان بحیثیت مجموعی اس تعبیر کو مانتے ہیں۔

اب یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ مغرب میں یہ موقف متفق علیہ نہیں رہا کہ اسلام کوئی جنگ جو مذہب ہے یا اس نوعیت کے واقعات کو اسلام کی حمایت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ٹائم میگزین میں کیرن آرم سٹرانگ (Karen Armstrong) کا ایک مضمون ''اسلام کا حقیقی پرامن چہرہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں اس تاثر کی قرآن مجید کے نظائر کی روشنی میں نفی کی گئی ہے کہ اسلام تشدد پسند دین ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلام میں اگر ان واقعات کے حق میں کوئی دلیل ہوتی جو ۱۱ستمبر کو پیش آئے تو اسلام کبھی دنیا کا سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا دین نہ ہوتا۔ اس نے مزید لکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جنگ کی نفسیات میں جینے والے عرب معاشرے کو اس فضا سے نکال کر امن اور بھائی چارے کا درس دیا، اگر انھوں نے کبھی جنگ لڑی تو اسی وقت جب انھیں اس پر مجبور کیا گیا۔ کیرن آرم سٹرانگ نے لکھا کہ اسلام آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا اصول مانتا ہے جو تورات میں بھی بیان ہوا ہے، لیکن اگر کوئی معاف کر دینے کی روش اختیار کرے تو قرآن اس کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے[1]۔

یہ بات بھی پوری طرح درست نہیں کہ مغرب یا امریکہ کا ہر آدمی اسلام یا مسلمانوں کے خلاف جنگ چاہتا ہے یا اس رجحان کی تائید کر رہا ہے۔ ''انڈی پینڈنٹ'' کے رابرٹ فسک اور معروف دانش ور نوم چومسکی جیسے حضرات اب امریکہ پر کھل کر تنقید کر رہے ہیں اور ان واقعات کو اس حکمت عملی کا ردعمل قرار دے رہے ہیں جو امریکہ نے مشرق وسطیٰ یا غریب اقوام کے معاملے میں اختیار کر رکھی ہے۔ ان کے نزدیک یہ سب کیا دھرا امریکہ کا اپنا ہے۔ اگر وہ فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم کی تائید نہ کرتا اور غریب ملکوں پر عرصۂ حیات تنگ نہ کرتا تو اس صورت حال سے دوچار نہ ہوتا۔ امریکہ کا ایک عام شہری بھی اب جنگ نہیں چاہتا اور اس رائے کے خلاف ہے کہ تشدد کا جواب تشدد سے دیا جائے۔ ۱۱ستمبر کو پینٹا گان میں امریکی فوج کا ایک ذمہ دار فرد کریگ سکاٹ امنڈسن (Craig Scott Amundson) بھی ہلاک ہوا۔ یہ اٹھائیس سالہ نوجوان دو بچوں کا باپ تھا۔ جب جنگ کی فضا بننے لگی اور انتقام کی آوازیں بلند ہوئیں تو اس کی اہلیہ امبر امنڈسن نے ایک مضمون لکھا جو ''شکاگو ٹریبون'' میں ۲۵ستمبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون میں اس نے لکھا:

---

[1] ہفت روزہ ''ٹائم''، یکم اکتوبر ۲۰۰۱ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''اس خوف نے میرے دکھ کو گہرا کر دیا ہے کہ میرے خاوند کی موت کو بہت سے معصوم لوگوں پر تشدد کے لیے جواز بنایا جا رہا ہے۔ امریکی قوم کے جو راہنما انتقام کی بات کر رہے ہیں، میں ان پر واضح کرنا چاہتی ہوں کہ اس سے میرے خاندان کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اگر آپ لوگ ۱۱ستمبر کے واقعات کو معصوم لوگوں پر تشدد کے لیے بطور دلیل استعمال کریں گے تو یہ میرے خاوند کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ انتقام کے الفاظ جو آپ کی زبانوں سے نکل رہے ہیں، میرے خاندان کے غم میں اضافہ کر رہے ہیں۔ میں اپنی قوم کے رہنماؤں سے یہ کہتی ہوں کہ وہ ۱۱ستمبر کے حادثے کو تشدد کے خاتمے کے لیے استعمال کریں۔ اور امریکی قوم کی صلاحیت اور وسائل کو نفرت اور تشدد سے آزادی کی خاطر ایک عالمی مکالمے کے لیے استعمال میں لائیں۔''

آج جو غلطی مغربی ذرائع ابلاغ مسلمانوں یا اسلام کے بارے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر کر رہے ہیں، ہم بھی مغرب کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت اسی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں ہمارے ہاں بھی ایک رائے یہی ہے کہ مغرب بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہے اور ہمیں بھی جواباً تیر وتفنگ لے کر میدان میں نکل آنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے درست نہیں ہے۔ امریکہ اور مغرب میں کیرن آرم سٹرانگ، رابٹ فسک، چومسکی اور امبرا میڈسن جیسے بہت سے لوگ بھی ہیں جو دوسری سمت میں سوچ رہے ہیں اور یہ محض چند نام نہیں، بلکہ ایک نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے جس کے حاملین کم نہیں ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات اخبارات وغیرہ میں نقل ہوئے ہیں اور بعض سے ہم ذاتی طور پر آگاہ ہیں کہ اس فضا میں کئی غیر مسلموں نے مسلمانوں کے تحفظ کا اہتمام کیا اور اس ماحول کو بدلنے کے لیے شعوری کوششیں کیں۔ پھر جس سطح کا یہ حادثہ تھا، اس کے ردعمل میں یہ واقعات کچھ ایسے زیادہ نہیں ہیں جو ایک پورے براعظم میں ہوئے۔

اس لیے ہمارے نزدیک آج ضرورت ہے کہ مسلمان مغرب میں موجود اس گروہ کو اپنا مخاطب بنائیں اور اس بات کی شعوری کوشش کریں کہ مستقبل میں مغرب اور اسلام کے مابین فاصلے کے بجائے قربت میں اضافہ ہو۔ تصادم کے بجائے مکالمے کی فضا قائم ہو۔ اگر کسی سمت سے صلیبی جنگوں کا کوئی احمقانہ نعرہ بلند ہو تو جواباً ویسا ہی نعرہ بلند کرنا کوئی حکیمانہ طرز عمل نہیں ہے۔ اس کی ایک ضرورت تو اس وجہ سے ہے کہ تصادم کسی طرح بھی انسانیت کے مفاد میں نہیں ہے۔ دنیا جب بھی کسی جنگ میں مبتلا ہوئی ہے اس کا انجام کسی خیر پر نہیں ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان آج مادی اعتبار سے اس قابل نہیں ہیں کہ کسی جنگ کے متحمل ہو سکیں۔ ہم آج معاشی اور عسکری اعتبار سے مغرب بالخصوص امریکہ کے رحم وکرم پر ہیں۔ ہمارے ایف ۱۶ امریکہ کی دین ہیں۔ اور یہ چل نہیں سکتے اگر امریکہ اس کے فالتو پرزے فراہم نہ کرے۔ دینا میں اسلحہ کے سب سے بڑے کارخانے امریکہ میں ہیں اور تمام مسلمان ملک ان کے خریدار ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اللہ کی تائید پر بھروسہ کرتے ہیں، لیکن اس باب میں بھی قرآنی اصول یہ ہے کہ اگر ہمارا ایمان صحابۂ کرام کی سطح کا ہو تب بھی مادی اعتبار سے ضروری ہے کہ دشمن کے مقابلے میں ایک اور دو کی نسبت ہو۔ آج نہ تو ہمارا ایمان ویسا ہے اور نہ ہم مادی اعتبار سے دشمن کے مقابلے میں آدھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قوت ہی رکھتے ہیں۔

مغرب کے ساتھ مکالمے کی فضا قائم کرنے کے لیےضروری ہے کہ اسلام کی اصل تعلیمات سے اہل مغرب کو روشناس کرایا جائے۔ اس تاثر کی نفی ضروری ہے کہ اسامہ بن لادن یا طالبان اسلام کا کوئی متفق علیہ تصور پیش کر رہے ہیں۔ یہ ایک رائے ہے جو انھوں نے مختلف مسائل میں اختیار کر لی ہے، جبکہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں اس سے اتفاق نہیں۔ یہ دوسرا نقطۂ نظر بھی پوری قوت کے ساتھ دنیا کے سامنے آنا چاہیے۔ اسلام میں جہاد کا تصور کیا ہے۔ مسلمان دوسری اقوام کے ساتھ روابط کے باب میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ خواتین اور اقلیتوں وغیرہ کے بارے میں کس نقطۂ نظر کے حامل ہیں؟ ارتداد اور مسلمان ریاست میں دوسرے ادیان کی تبلیغ کے حوالے سے ان کا موقف کیا ہے؟ اقوام عالم کے باہمی تعلق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان سب سوالات پر ہمیں مغرب سے مکالمہ کرنا چاہیے اور اس تاثر کی نفی کرنا چاہیے کہ ان امور میں طالبان یا اسامہ بن لادن نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ مسلمانوں کا کوئی متفقہ موقف ہے۔

دوسری طرف اس کی بھی ضرورت ہے کہ خود مسلمانوں میں دین کے صحیح تصور کو فروغ ملے۔ آج اسامہ بن لادن اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو پوری دیانت داری کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہوں گے کہ موجودہ دور میں اعلاے کلمۃ اللہ کا وہی راستہ ہے جو انھوں نے اپنایا ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان مسائل کے بارے میں دینی احکامات کیا ہیں اور کہیں ایسا تو نہیں کہ تمام تر اخلاص کے باوجود ہمارا طرز عمل دین کے فروغ میں مانع ہو رہا ہو۔ یہ اسی وقت ہو گا جب مسلمان ایک دوسرے کی رائے کو دیانت داری اور سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کریں گے اور کوئی گروہ اپنے بارے میں کبھی اس زعم میں مبتلا نہیں ہو گا کہ اس کا فہم دین ہی اسلام کی درست ترین تعبیر ہے اور اس کے علاوہ سب کچھ ضلالت اور گمراہی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو کچھ ہمیں میسر ہے، اسے ضائع کرنا مشکل نہیں، لیکن جو کچھ ہمارے پاس نہیں ہے، اس کا حصول آسان نہیں ہے۔ حاصل کے استعمال کے لیے بے تابی سے زیادہ آج مطلوب وہ جدوجہد ہے جو ہمارے دامن کو ان چیزوں سے بھر دے جو ہمیں میسر نہیں رہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب علم اور سائنس کے مراکز عالم مغرب سے عالم اسلام کی طرف منتقل ہوں گے، دنیا کا قبلہ بھی خود بخود تبدیل ہو جائے گا۔ آج ہمیں ایک طرف اس کے لیے جدوجہد کرنی ہے اور دوسری طرف جو کچھ انسانی و مادی وسائل ہمیں میسر ہیں ان کا تحفظ کرنا ہے۔ ان دونوں کاموں کے لیے تصادم سے گریز اولین شرط ہے۔ موجودہ افغان امریکہ تنازع کا جو حل بھی سامنے آئے، بہر حال دنیا کو اسی طرف لوٹنا ہو گا کہ تصادم کسی فریق کے حق میں نہیں ہے۔ اگر امریکہ عالمی قوت ہونے کے زعم میں اسے جاری رکھتا ہے تو پھر یہ کچھ لازم نہیں کہ نتائج ہمیشہ اس کے حق میں رہیں اور اگر مسلمان اس راستے پر چلتے ہیں تو بھی ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کسی خیر کی صورت میں نہیں نکل سکتا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

صلح حدیبیہ اور جہاد وقتال

امریکا نے نیویارک اور واشنگٹن میں ہونے والی دہشت گردی کا الزام اسامہ بن لادن پر لگایا۔ اسامہ کو چونکہ طالبان نے افغانستان میں پناہ دے رکھی ہے، لہٰذا امریکا نے طالبان سے مطالبہ کیا کہ وہ اسامہ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ طالبان نے انکار کیا۔ افغانستان کا ہمسایہ ہونے اور وہاں اپنا خاص اثر ورسوخ رکھنے کے باعث امریکا نے پاکستان کو تعاون کرنے کے لیے کہا۔ اس سے پاکستان کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اس کے باوجود پاکستان نے امریکا کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس مسئلے کے حوالے سے صدر پرویز مشرف نے قوم سے ایک خطاب کیا، جس میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ حکومت نے دہشت گردی اور طالبان کے مقابلے میں امریکا اور عالمی برادری کی حمایت کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کا اعلان کیوں کیا۔ اپنے اس موقف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے انھوں نے میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ کا حوالہ دیا۔ اور تاریخ اسلامی کے ان غیر معمولی واقعات سے یہ نتیجہ نکالا کہ مشکل حالات میں جذباتیت کا شکار ہو کر خواہ مخواہ تصادم کرنے کے بجائے حکمت اختیار کر کے تصادم سے بچ جانا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہتر ہے۔

صدر پرویز مشرف کے ایسے دلائل دینے کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے پاکستان میں مذہب کی غیر معمولی اہمیت کو محسوس کیا اور دلائل کے ذریعے سے لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ بلاشبہ اس معاملے میں بھی حکومت نے حکمت اور حقیقت کا راستہ اختیار کیا۔

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ مسئلے کو صحیح معنوں میں جڑ بنیاد سے نہیں لیا گیا۔ اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ پاکستان میں متشدد مذہبی گروہ میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ کے حوالے سے حکمت، صبر اور فراخ دلی کا کوئی سبق حاصل نہیں کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے جب میثاق مدینہ یا صلح حدیبیہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو انھیں جہاد وقتال کرنے سے متعلق آیاتِ الٰہی یاد آ جاتی ہیں۔

ان لوگوں کے رہنما ایسی آیات کو بہت نمایاں کر کے بار بار بیان کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے ذہنوں میں ایسی آیات

ثبت ہو چکی ہوتی ہیں۔ ان کا موقف یہ ہوتا ہے کہ امریکا مسلمانوں کا دشمن ہے۔ یہ اسرائیل جیسے مسلمان دشمن کی مسلسل پشت پناہی کر رہا ہے اور اس کی بھرپور حمایت اور امداد کیے جا رہا ہے۔ ادھر عراق پر بارود کی آگ برسا کر اور پابندیاں لگا کر لاکھوں عراقیوں کا قتل عام کر رہا ہے۔ اسی طرح دیگر مسلم ممالک کو بلاجواز نقصان پہنچا رہا ہے۔ ان پر غیر انسانی پابندیاں عائد کر رہا ہے۔ ہندوستان کشمیریوں پر ظلم کر رہا ہے۔ روس وسطی ایشیائی آزاد مسلم ریاستوں پر ظلم کر رہا ہے۔ مسلمان حکمران دینی حمیت سے عاری ہیں۔ ان سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مظلوموں کی مدد کریں اور ظالموں کو سزا دیں۔ لہٰذا وہ مجبوراً خود جہاد و قتال کرنے کے لیے میدان میں اتر آتے ہیں۔ اور ہر طرح کی صورت حال میں جان لینے اور جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کا محرک ایک مذہبی جذبہ ہوتا ہے، جو اطاعت خداوندی اور جنت کے حصول کی خواہش پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے کسی حکومت کی سختی انھیں ہرگز متزلزل نہیں کر پاتی۔ اگر کسی خوف سے یہ لوگ پیچھے بھی ہٹیں تو ان کا یہ عمل قلبی اور مستقل طور پر نہیں، بلکہ ظاہری اور عارضی طور پر ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں کے اندر قلبی اور مستقل تبدیلی لانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے موقف کے ماخذ کو تلاش کیا جائے، ان کے استدلال کو سمجھا جائے اور پھر اس کے مطابق دلیل، تہذیب اور دل سوزی کے ساتھ ان پر ان کی غلطی واضح کی جائے۔ اسی سے مسئلے کے پرامن طریقے اور جڑ بنیاد سے حل ہونے کا امکان ہے، ورنہ دوسرا ہر راستہ تناؤ، تلخی اور تصادم کی طرف جاتا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کے وہ مسائل جو مخصوص مذہبی فہم سے پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے چند علمی نکات کا غیر معمولی مقام اور کردار ہے۔

ایک نکتہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید ایک کتاب ہے۔ ایک منظّم اور باربط کتاب۔ یہ الگ الگ اور متفرق آیات واحکام کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ نہایت حکیمانہ نظم کی لڑی میں پرویا ہوا مربوط کلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے جب قرآنِ مجید کو انسانی کلام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے الہامی ہونے کی ایک دلیل دیتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ ایسی بات ہے تو اس کتاب کی آیتوں جیسی کوئی آیت تخلیق کر کے پیش کرو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کی ایک یا ایک سے زائد سورتوں جیسی کوئی سورت بنا کر دکھاؤ۔[1]

لہٰذا ضروری ہے کہ آیاتِ الٰہی کو ان کے سیاق وسباق اور مخصوص پس منظر میں رکھ کر سمجھا جائے۔ بصورتِ دیگر بڑی آسانی سے آیات کے ایسے مفاہیم نکالے جا سکتے ہیں جو سرے سے خدا کا منشا ہی نہ ہوں۔ یہ آیات کا سیاق وسباق اور مخصوص پس منظر ہی ہے جو خدا کی اصل بات سامنے لاتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ رسولوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ایک قانون اتمامِ حجت ہے۔ اس قانون کے تحت ایک رسول کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے۔ اپنی قوم پر دین حق ہر پہلو سے واضح کرتا ہے۔ ان کے ہر سوال کا جواب دیتا ہے، ہر اعتراض کو رفع کرتا

---

[1] البقرہ ۲: ۲۳۔ ہود ۱۱: ۱۳۔

ہے۔اور جب قوم اس کے باوجود محض اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتی اور کفر پر قائم رہتی ہے تو اس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔قوم نوح، قوم لوط، قوم صالح، قوم شعیب کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔اور اگر رسول کو سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے تو پھر اس کے لشکر کے ذریعے سے یہ عذاب آتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اقتدار مل گیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفار کے خلاف اسی عذاب کے پہلو سے جہاد و قتال کرنے کا حکم دیا، مگر کفار نے اس قتال سے پہلے ہی اسلام قبول کر لیا۔مگر ان کے خلاف جہاد و قتال کے حکم پر مبنی آیات بہرحال قرآن مجید میں موجود ہیں۔یہ جہاد و قتال رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مخاطب قوم کے ساتھ خاص ہے۔مگر ہمارے ہاں ایسی خاص آیات کو سیاق و سباق سے کاٹ کر عام کر دیا جاتا ہے اور ان کی بنیاد پر لوگوں کو غیر مسلموں کے خلاف جہاد و قتال کے لیے ابھارا جاتا ہے۔

لہٰذا یہ بات بطور اصول واضح رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کی ہر آیت کا مخاطب ہر شخص نہیں ہوتا۔بعض آیات کے مخاطب صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔بعض آیات کے مخاطب صرف صحابۂ کرام ہیں۔بعض آیات کے مخاطب دورِ نبوی کے مشرکین عرب ہیں۔بعض آیات کے مخاطب دورِ نبوی کے یہود و نصاریٰ ہیں۔بعض آیات کے مخاطب صرف مسلمانوں کے حکمران ہیں۔

قرآن مجید میں جہاد و قتال کے احکام کی ایک قسم تو وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور اسی پہلو سے صحابۂ کرام کی دنیا پر حق کی شہادت دینے کی ذمہ داری کے ساتھ خاص ہے۔جہاد و قتال کے احکام کی دوسری قسم وہ ہے جو دنیا میں ہونے والے ظلم و عدوان کے متعلق ہے۔یہ معلوم ہے کہ مکہ میں صحابۂ کرام پر کفار نے مظالم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔اسی ظلم کی وجہ سے وہ اپنے پرسکون گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔اس کے باوجود اہل مکہ کی جارحیت جاری رہی۔چنانچہ مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکمران کی حیثیت سے یہ اجازت دی گئی کہ وہ مکہ کے ظالموں کی جارحیت کے خلاف جہاد و قتال کر سکتے ہیں۔سورۂ حج میں ہے:

> ''جن سے جنگ کی جائے، انھیں جنگ کی اجازت دی گئی، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''
> (الحج ۲۲: ۳۹۔۴۰)

یہی جہاد و قتال ہے جو ابد تک کیا جا سکتا ہے۔قانون اتمامِ حجت سے متعلق جہاد و قتال ختم نبوت کے ساتھ ختم ہو گیا۔

واضح رہے کہ جہاد و قتال ہمیشہ کسی حکمران کے تحت کیا جاتا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ کسی نبی یا کسی رسول نے اس وقت تک جہاد و قتال نہیں کیا جب تک اسے سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہو گیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام پر مظالم تو اس وقت بھی ہو رہے تھے جب یہ ہستیاں مکہ میں موجود تھیں، اور شرک و کفر کی انتہا یہ تھی کہ بیت اللہ کو بت کدہ بنا دیا گیا تھا، مگر مکی سورتیں اور تاریخ گواہ ہیں کہ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد و قتال کا نام بھی نہیں لیا۔جب آپ مدینہ کے حکمران بن گئے تب جہاد و

قتال ہوا۔ حضرت موسیٰ نے اس وقت تک جہاد و قتال نہیں کیا جب تک اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر اپنی حکومت کے تحت ایک آزاد علاقے میں منظّم نہیں کر لیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوا تو آپ نے جہاد و قتال کا ذکر بھی نہیں کیا۔ انجیل ان الفاظ سے بالکل خالی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوٹوک اسلوب میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ:

''مسلمانوں کا حکمران ان کی سپر ہے، قتال اسی کے پیچھے رہ کر کیا جاتا ہے اور لوگ اپنے لیے اُسی کی آڑ پکڑتے ہیں۔''

(بخاری، رقم ۲۹۵۷)

فقہا کا موقف بھی اس معاملے میں یہی ہے۔ ''فقہ السنۃ'' میں ہے:

''کفایہ فرائض کی تیسری قسم وہ ہے جس میں حکمران کا ہونا لازم ہے، جیسے جہاد اور اقامتِ حدود، اس لیے کہ اس کا حق تنہا حکمران کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کوئی شخص بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی دوسرے پر حد قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔''

(۱۰/۳)

یہ رویہ غیر معمولی جسارت پر مبنی ہے کہ جہاد و قتال کے حوالے سے حکمران کی بنیادی شرط دین و شریعت میں اس قدر واضح ہونے کے باوجود لوگ اپنے موقف کی بنیاد ایک صحابی حضرت ابوبصیر کے اپنے طور پر کفار کے خلاف اقدامات پر رکھتے ہیں۔ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ہم یہاں حضرت ابوبصیر کے معاملے کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ابوبصیر رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد وہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آ گئے۔ صلح حدیبیہ کی ایک شرط کے مطابق ریاست مدینہ اس بات کی پابند تھی کہ مکہ کا کوئی شخص اگر مسلمان ہو کر مدینہ آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو واپس کر دیں گے۔ چنانچہ مشرکین مکہ کی طرف سے دو آدمی انھیں واپس لے جانے کے لیے مدینہ پہنچے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے مطابق ابوبصیر کو ان کے حوالے کیا اور کہا: ابوبصیر، تم جانتے ہو کہ ان لوگوں کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہے۔ ہم اس معاملے میں بے وفائی نہیں کریں گے، اس لیے تم قریش کی طرف واپس چلے جاؤ۔ ابوبصیر نے کہا: کیا آپ مجھے ان مشرکین کو لوٹا رہے ہیں۔ یہ مجھے اپنے دین سے پھر جانے کے لیے اذیت دیں گے؟ آپ نے فرمایا: صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھو، یقیناً اللہ تمھارے لیے کوئی راستہ نکال دے گا۔ حضرت ابوبصیر جانے پر آمادہ ہو گئے، مگر انھوں نے مکہ جاتے ہوئے ایک شخص کو باتوں میں لگا کر قتل کر دیا اور دوسرا اپنی جان بچا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس مدینہ آ گیا۔ اس نے آپ سے کہا: اللہ کی قسم میرا ساتھی قتل کر دیا گیا ہے اور میں بھی یقیناً مار دیا جاؤں گا۔ اتنے میں ابوبصیر بھی ہاتھ میں تلوار لیے وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: یا رسول اللہ، مجھے ان کے حوالے کر کے عہد نامہ کی رو سے آپ پر جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی، وہ آپ نے پوری کر دی۔ اب میرے کسی عمل کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ اب اللہ نے مجھے ان سے نجات دے دی ہے۔ اس کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کسی نے اس کا ساتھ دیا تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا کر رہے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات سے ابوبصیر سمجھ گئے کہ آپ انھیں قریش کے حوالے کر دیں گے۔ لہٰذا وہ مدینہ چھوڑ کر سمندر کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کنارے مقیم ہو گئے۔قریش میں سے بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ حال کا ذمہ دار ٹھیرانے کی کوشش کی اور آپ سے دیت کا مطالبہ کرنا چاہا تو ان کے امیر ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کی ذمہ داری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ان پر جو ذمہ داری تھی، وہ انھوں نے پوری کر دی۔ انھوں نے اسے ہمارے نمائندوں کے حوالے کر دیا تھا اور ابوبصیر نے ان کے حکم سے ہمارے نمائندے کو قتل نہیں کیا۔ آہستہ آہستہ ابوبصیر کے پاس دوسرے نومسلم بھی جمع ہونے لگے۔ انھیں جب بھی یہ خبر ملتی کہ قریش کا کوئی قافلہ ادھر سے گزر رہا ہے تو وہ اسے لوٹ لیتے۔ قریش اس صورتِ حال سے بڑے پریشان ہوئے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی بھیجا اور اللہ کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ آپ ابوبصیر کو ایسا کرنے سے منع کر دیں۔ اس کے لیے انھوں نے صلح حدیبیہ کی وہ شرط بھی ختم کر دی۔ چنانچہ اس کے بعد نومسلموں کے لیے مکہ سے مدینہ آنے کی راہ کھل گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبصیر کو مدینہ بلوا لیا اور لوٹ مار کرنے سے روک دیا۔

حضرت ابوبصیر ہی کے حوالے سے جناب جاوید احمد غامدی نے لکھا:

> ''اس زمانے میں بعض لوگ اس [جہاد و قتال کے لیے حکمران کی شرط] کی تردید میں صلح حدیبیہ کے بعد قریش کے خلاف ابوبصیر رضی اللہ عنہ کی غارت گری سے استدلال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محض علم و نظر کا افلاس ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۂ انفال (۸) کی آیت ۷۲ میں پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ منتقل نہیں ہو سکے، ان کے کسی معاملے کی کوئی ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ریاست مدینہ کے مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی۔ پھر یہی نہیں، بخاری کی روایت (رقم ۲۷۳۱) کے مطابق خود حضور نے ابوبصیر کے ان اقدامات پر یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ 'ویل امه مسعر حرب لو کان له احد' (اس کی ماں پر آفت آئے، اسے کچھ ساتھی مل گئے تو جنگ کی آگ بھڑکا کر رہے گا)۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان اقدامات کے بارے میں آپ کی رائے کیا تھی۔'' (میزان، ۲۴۴)

ہماری مذہبی دنیا میں ان نکات کو سرے سے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ لوگ آیاتِ الٰہی کو اس کے مخصوص پس منظر اور سیاق و سباق سے غیر متعلق کرتے ہیں اور اسے اپنی خواہش پر مبنی مفہوم دے دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اور صحابۂ کرام کے امت وسط ہونے کی حیثیت کے ساتھ خاص آیات کی بنیاد پر اپنی جماعتوں کے لائحۂ عمل ترتیب دینے لگتے ہیں اور حکمرانوں کے ساتھ خاص احکامِ الٰہی پر خود عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج دنیا میں مسلمانوں پر جو دہشت گردی کا الزام لگ رہا ہے، اس کی بنیادی علمی وجہ یہ ہے۔

افضال ریحان/ جاوید احمد غامدی

جہاد اور دہشت گردی

مدیر ''اشراق'' سے روز نامہ ''پاکستان'' کے جناب افضال ریحان کی گفتگو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

[نیو یارک میں دہشت گردی اور امریکا افغانستان جنگ کے پس منظر میں اس گفتگو کا بیشتر حصہ ہم اپنے قارئین کے لیے ضروری تدوین کے بعد یہاں شائع کر رہے ہیں۔ ادارہ]

سوال: آپ کے نزدیک دہشت گردی کی کیا تعریف ہے؟

جواب: غیر مقاتلین (Non-Combatants) کی جان، مال یا آبرو کے خلاف غیر علانیہ تعدی دہشت گردی ہے۔ غیر مقاتلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حالتِ جنگ میں نہ ہوں۔ ان کے خلاف اگر کوئی اقدام انھیں اپنی حفاظت کے لیے متنبہ کیے بغیر کیا جائے تو وہ دہشت گردی قرار پائے گا۔ چنانچہ ہیروشیما، ناگاساکی پر ایٹمی تاخت، نیو یارک اور واشنگٹن میں حالیہ تباہی اور مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی کے باہر بموں سے حملہ دہشت گردی ہی کے اقدام ہیں۔

عام شہری تو بہرحال غیر مقاتلین ہیں، لیکن اگر مسلح افواج بھی برسرِ جنگ نہیں ہیں تو ان پر بھی غیر علانیہ حملہ دہشت گردی قرار پائے گا۔ گویا دہشت گردی وہ کارروائی ہے جس میں یہ دو شرطیں ہر حال میں پائی جاتی ہوں:

۱۔ غیر مقاتلین کے خلاف اقدام۔

۲۔ غیر علانیہ اقدام۔

سوال: آپ کے خیال میں جہاد کی کیا تعریف ہے؟

جواب: شریعت کی رو سے ظلم و عدوان کے خلاف کسی منظّم حکومت کے تحت علانیہ اقدامِ جنگ جہاد ہے۔ گویا وہی اقدام جہاد قرار پائے گا جس میں یہ تین شرطیں پوری کی گئی ہوں:

۱۔اقدام ظلم وعدوان کے خلاف ہو۔

۲۔منظّم حکومت کے تحت ہو۔

۳۔علانیہ ہو۔

ان شرائط کو پورا کیے بغیر کسی کارروائی کو جہاد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: کوئی فرد یا گروہ اپنی انفرادی حیثیت میں اگر جہاد کا اعلان کرتا ہے اور سلسلۂ جنگ شروع کر دیتا ہے تو کیا اسے جہاد قرار دیا جائے گا؟

جواب: یہ اقدام جہاد نہیں قرار پائے گا، کیونکہ جہاد تو ہوتا ہی منظّم حکومت کے تحت ہے۔ جس طرح کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآن میں چور کی سزا کا حکم پڑھ کر چوروں کے ہاتھ کاٹنے شروع کر دے، اسی طرح اقتدار کے بغیر کسی فرد کو بندوق اٹھانے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔

سوال: اس سلسلے میں ایک حدیث بھی بہت بیان کی جاتی ہے کہ جب تم کوئی برائی دیکھو تو اسے ہاتھ سے روکو۔ اس کی بنیاد پر عام مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ طاقت رکھتے ہوں تو انھیں برائی کے خلاف اقدام کرنا چاہیے؟

جواب: اس حدیث کا تعلق دائرۂ اختیار سے ہے۔ ہر شخص کا ایک دائرۂ اختیار ہوتا ہے۔ شوہر کا دائرۂ اختیار اس کا خاندان ہے، باپ کا دائرۂ اختیار اس کی اولاد ہے، حکمران کا دائرۂ اختیار اس کی مملکت ہے۔ اس دائرۂ اختیار میں صاحبِ اختیار اگر ضرورت محسوس کرے تو کسی برائی کو قوت سے روک سکتا ہے۔ یعنی یہ حدیث ہر آدمی سے اس کے دائرۂ اختیار کے حوالے ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''میزان'' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ آپ اسے وہاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سوال: خودکش حملے جنھیں آج فدائی حملوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: اگر کارروائی کی نوعیت دہشت گردی کی ہے یعنی وہ غیر مقاتلین کے خلاف غیر علانیہ طور پر کی گئی ہے تو خواہ وہ خودکش حملے کے طریقے پر کی گئی ہے یا اس سے گریز کرتے ہوئے، بہر حال ناجائز ہے۔ لیکن اگر ایک منظّم فوج علانیہ جنگ کر رہی ہے اور اس کا کوئی سپاہی کسی موقع پر اپنے آپ کو خودکش حملے کے لیے پیش کر دیتا ہے تو اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ جہاد سے مراد خود ساختہ جہاد نہیں، بلکہ ایک منظّم حکومت کے تحت مقاتلین کے خلاف کیا جانے والا علانیہ جہاد ہے۔

سوال: کشمیر میں جو مجاہدین خودکش حملے کر رہے ہیں، ان کی کیا نوعیت ہے؟

جواب: وہ چونکہ جہاد کی بنیادی شرائط پوری نہیں کر رہے، اس لیے ان کے حملوں کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ یہ جنگ نہ کسی منظّم حکومت کے تحت لڑ رہے ہیں، نہ ان کی جنگ علانیہ ہے اور نہ وہ مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان فرق کر رہے ہیں۔

اس وقت بھارت کی فوج ہمارے لیے مقاتلین کی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ ہم ان سے برسر جنگ نہیں ہیں۔

سوال: جہاد کے حوالے سے مولانا طنطاوی کے فتوے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: بھائی، میں نے دین کی رو سے دہشت گردی اور جہاد کی تعریف آپ کے سامنے بیان کر دی ہے، آپ اس کی روشنی میں خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے اہل علم کی آرا پر میں تبصرہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، اسے بیان کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

سوال: کیا امریکا کا افغانستان پر حملہ بھی دہشت گردی نہیں؟

جواب: حملے کی شناعت دوسرے وجوہ سے اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن اگر امریکا وہاں صرف مقاتلین کے خلاف کارروائی کر رہا ہو اور یہ کارروائی علانیہ ہو تو اسے دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ، اگر وہ یک بیک کابل اور قندھار کے شہری علاقوں پر بم باری شروع کر دیتا ہے تو یہ اقدام ہر لحاظ سے دہشت گردی ہو گا۔ یہ اسی طرح کا مجرمانہ اقدام ہو گا جس طرح ہیروشیما اور ناگاساکی پر کیا گیا۔

سوال: لیکن اگر بم باری کا اصل ہدف تو فوجی اڈے اور مقاتلین ہیں، مگر قریبی گاؤں اور بستیاں بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں معصوم جانیں تباہ ہو جاتی ہیں تو کیا اس صورت میں بھی اسے دہشت گردی نہیں کہا جائے گا؟

جواب: یہ معاملہ دنیا کی ہر جنگ میں ہوتا ہے۔ یعنی ایسی کسی جنگ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی جس میں عام شہریوں کی جان و مال کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ انھیں دانستہ ہدف نہ بنایا جائے۔ جنگ علانیہ ہو تا کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے خطرے کی جگہوں سے نکلنا چاہیں، تو نکل جائیں۔

سوال: آپ کی بات تو بہت واضح ہے، لیکن ہمارے علما اس سے بہت مختلف جگہ پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں؟

جواب: ہمارے علما اپنے علم و فہم کے مطابق کہہ رہے ہیں اور میں اپنے علم و فہم کے مطابق بیان کر رہا ہوں۔ جس بات پر آپ کا اطمینان ہو، آپ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔

سوال: غلامی کے خلاف آزادی کی جنگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: آزادی اور غلامی کے الفاظ جو آج کل استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ جمہوریت کے بعد بالکل بے معنی ہو چکے ہیں۔ جو لوگ یہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں، وہ اصل میں پچھلی صدی میں رہ رہے ہیں۔ دنیا میں آزادی اور غلامی کے تصورات ہی بالکلیہ بدل گئے ہیں۔ اب حکومت اکثریت کی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اگر ہندوؤں کی اکثریت ہے تو ان کی حکومت ہو گی اور اگر ہم اپنی اکثریت قائم کر لیتے ہیں تو ہماری حکومت ہو گی۔ تاہم کسی جگہ اگر اکثریت پر کوئی اقلیت اپنا تسلط قائم کیے ہوئے ہے تو اس کے خلاف سیاسی جدوجہد کرنی چاہیے۔ جنگ و جدال جیسے اقدامات کبھی پابندِ حدود نہیں رہتے۔ ان کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو اس وقت پوری دنیا کے لیے ایک مصیبت بن کر نکل آیا ہے۔ ان سے ہر حال میں گریز کرنا چاہیے۔

سوال: لیکن کشمیر میں تو مسلمانوں کی اکثریت ہے؟

جواب: کشمیر کی صورتِ حال مختلف ہے۔ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین تنازع یہ ہے کہ یہ خطہ

www.javedahmadghamidi.com

ہندوستان کا حصہ ہے یا پاکستان کا۔ وہاں جھگڑا اکثریت اور اقلیت کا نہیں ہے۔ وہاں ایک سیاسی مسئلہ ہے کہ ہندوستان یہ کہتا ہے کہ کشمیر کا الحاق ہمارے ساتھ ہو چکا ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ نہیں ہوا۔ یہ اصل میں 1947ء کا ایجنڈا ہے جس پر دو ملکوں کے مابین سیاسی اختلاف ہے۔ اسے سیاسی طریقے ہی سے طے ہونا چاہیے۔

سوال: یہ جہادی کلچر جو ہمارے ہاں ترقی پا رہا ہے، اس کی اسلام میں کس حد تک گنجایش ہے؟

جواب: جس اسلام کو میں جانتا ہوں، اس میں اس کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

سوال: آپ تو وہی بات کر رہے ہیں جو بش اور ٹونی بلیئر کر رہے ہیں؟

جواب: میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کر رہا ہوں اور مجھے بہت خوشی ہے کہ آج ان کی بات دوسرے لوگوں نے بھی کرنی شروع کر دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ان دونوں سے بہت پہلے ہوئی تھی۔ آپ نے یہ بات 14 صدی پہلے کی تھی، بلکہ آپ سے پہلے کے تمام انبیا علیہم السلام کا اسوہ بھی یہی ہے کہ جب تک باقاعدہ اور منظّم حکومت قائم نہ ہو، وہ نہ سزا نافذ کرتے ہیں، نہ قتال کرتے ہیں۔

سوال: اب اگر حکومت ہی نہ ملے تو پھر کیا کیا جائے۔ جہادی گروہ کہتے ہیں کہ مسئلے کو بھی تو زندہ رکھنا ہے؟

جواب: بھائی، میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ پچھلی صدی میں یہ سیاسی انقلاب برپا ہو چکا ہے کہ اب قوموں پر قبضے نہیں کیے جاتے۔ یہ تو اس زمانے کا مسئلہ تھا جب ایک قوم اٹھتی تھی اور اپنی قوت کے بل بوتے پر دوسری قوم کو غلام بنا لیتی تھی۔ اب تو اکثریت کی حکومت ہوتی ہے۔ اس معاملے میں تشویش ان کو ہونی چاہیے جو محض ایک قوم ہیں، ہم تو اس کے ساتھ دعوت بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آج ہم کسی جگہ اقلیت میں ہوں اور کل اسی کو اپنی دعوت سے اکثریت میں بدل دیں۔

سوال: یہ دعوت والی بات اب پرانی لگتی ہے۔ اس وقت ہمارے علماے دین تو کہیں دعوت وغیرہ کی بات نہیں کرتے؟

جواب: دین کی حقیقتیں ابدی ہیں۔ اگر ساری دنیا بھی انھیں فراموش کر دے تب بھی قائم رہیں گی۔

سوال: مسئلۂ فلسطین کا آپ کیا حل سمجھتے ہیں۔ وہاں پر اسرائیل مسلمانوں پر جو ظلم کر رہا ہے، اس پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

جواب: میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا آپ اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں؟

سوال: نہیں کرتے؟

جواب: تو پھر اس سے کیوں مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ آپ کو تسلیم کرے۔

اسرائیل ایک واقعہ کے طور پر اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ اس کا وجود جائز ہے یا ناجائز۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس واقعے کو دنیا میں کالعدم کر سکیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم امن چاہتے ہیں یا جنگ؟ اگر امن چاہتے ہیں تو اس واقعہ کو بالفعل تسلیم کرنا پڑے گا۔ بنگلہ دیش کو نہیں بننا چاہیے تھا، مگر وہ بن گیا۔ اب ہم اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کریں یا اس کے خلاف جنگ کریں؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انصاف حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو ممکن حل پر اکتفا کر لینی چاہیے۔ دانش مندی کا تقاضا یہی ہے۔ ہر جگہ ممکن حل پر اکتفا کر کے امن کی ضمانت حاصل کیجیے اور اپنی غربت اور جہالت کے خلاف جنگ کی ابتدا کر دیجیے۔ امتِ مسلمہ کے لیے اس وقت کی صورت حال میں صحیح لائحۂ عمل یہ ہے۔

سوال: بیت المقدس ہمارا قبلۂ اول ہے، وہ مسلمانوں کے پاس ہونا چاہیے؟

جواب: بیت المقدس ان کا ہم سے پہلے کا قبلہ ہے۔

سوال: تو پھر اس کا حل کیا ہے؟

جواب: مسئلہ یہ ہے کہ بیت المقدس کے ساتھ ہماری بھی پوری دلچسپی اور جذباتی وابستگی ہے، یہودیوں کی بھی ہے اور عیسائیوں کی بھی۔ تینوں مذاہب کے لیے وہ ایک مقدس جگہ ہے۔ اس لیے اس کے منصفانہ حل دو ہی ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ وہ کسی بین الاقوامی ادارے کے تحت ہو۔

دوسرے یہ کہ تینوں مذاہب کے نمائندے اس کا نظم ونسق چلائیں۔

اس پر مسلمانوں کا بھی حق ہے، عیسائیوں کا بھی حق ہے اور یہودیوں کا بھی حق ہے۔

سوال: ایک بات جو بار بار کی جارہی ہے کہ قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے۔ جب یہ قرآن میں آ گیا ہے تو ہم اس کی اجازت دینے والے کون ہیں؟

جواب: یہ بات جزیرہ نمائے عرب کے ان یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہی گئی ہے جن پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمامِ حجت کیا تھا۔ یہ بات قومی حیثیت میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں نہیں کہی گئی۔ اگر اس کو ان کی قومی حیثیت سے متعلق کیا جائے تو پھر اہلِ کتاب خواتین سے نکاح کی اجازت کے کیا معنی ہیں؟ یہ نکاح کیا دوستی اور محبت کے جذبات کے بغیر ہو جائے گا؟ درحقیقت عرب کے یہود و نصاریٰ وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر کمر بستہ ہو گئے تھے اور انھوں نے وہاں پر مسلمانوں کو مٹا دینے کی سازشیں کی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے عرصے تک ان کے ساتھ معاہدات رکھے، دوستانہ روابط قائم کیے، لیکن وہ دشمنی سے باز نہیں آئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اب تو یہ واضح ہو گیا ہے کہ ان کے ساتھ دوستی کا تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔

سوال: آپ سے گفتگو کے بعد اسلام کا خوف ناک تصور باقی نہیں رہتا؟

جواب: جو دین امن و امان اور سلامتی کا دین ہے، وہ خوف ناک کیسے ہو سکتا ہے۔

سوال: جو دین ہم سنتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ مار دو، زندہ نہ چھوڑو، بچ کر نہ جائے۔

جواب: دین کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننا چاہیے۔ انھوں نے جو دین بیان کیا ہے، وہ تو امن و سلامتی اور رحمت و محبت سے عبارت ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سوال: آج کل میثاقِ مدینہ کے حوالے سے بھی گفتگو سامنے آ رہی ہے۔ آپ فرمائیے کہ میثاقِ مدینہ کیا ہے؟ اور موجودہ تناظر میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

جواب: میثاقِ مدینہ کی بڑی غیر معمولی اہمیت ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ کسی علاقے میں اگر مسلمانوں کی حکومت ہو تو اقلیتوں کے ساتھ وہ کن اصولوں پر معاہدات کر سکتے ہیں۔

سوال: گزشتہ رات مولانا سید سلیمان ندوی کے فرزند ارجمند سید سلمان ندوی نے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق مسلمانوں کے برابر ہوتے ہیں۔ میرے ذہن میں فوراً آپ کی یہ بات آئی کہ غیر مسلم تو معاہدین بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب: میں اس پر بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اسلامی حکومت میں اب جو بھی غیر مسلم ہوں گے، وہ سب معاہدین ہوں گے اور ان کے ساتھ آپ جن شرائط پر چاہیں، معاہدہ کر سکتے ہیں۔ تمام مسلمان ریاستیں اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر چکی ہیں اور اس کی رو سے اقلیتوں کے حقوق مان چکی ہیں۔

سوال: آپ اس بات کو نہ چھیڑیں، وہاں تو یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ہر شخص کو مذہب بدلنے کی آزادی ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے مذہب اپنائے؟

جواب: یہ آزادی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے۔

سوال: لیکن ہم تو یہ بات نہیں مانتے۔ ہم نے جو دین سنا ہے، اس کے مطابق تو مذہب بدلنے والا مرتد اور واجب القتل ہوتا ہے؟

جواب: یہ مسئلہ بھی ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ اس موضوع پر میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ یہ ایک علمی بحث ہے۔ اسے آپ میری کتاب ''برہان'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

سوال: بس ایک دو جملوں میں اس کا خلاصہ بتا دیں؟

جواب: اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمام حجت سے ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بحیثیتِ رسول ایک خصوصی حکم تھا اور اس کا تعلق ان لوگوں سے تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست مخاطب تھے۔ موجودہ زمانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں دہشت گردی کے اس واقعے کے بعد اسامہ بن لادن اور افغانستان کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

جواب: دہشت گردی کے حادثے کے بعد امریکا، بلکہ پوری دنیا نے یہ الزام لگا دیا تھا کہ اسامہ بن لادن دہشت گردی میں ملوث ہیں اور افغانستان ان سے تعاون کر رہا ہے۔ اس الزام کی کچھ جزوی تصدیق پاکستان اور سعودی عرب نے بھی کر دی تھی۔ جب پوری دنیا نے ان کی طرف انگلی اٹھا دی تھی تو پھر انھیں چاہیے تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے آپ کو ٹرائل کے لیے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پیش کر دیتے۔ وہ یہ کہتے کہ ہم دنیا کی عالمی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ افغانستان کی حکومت بھی یہ کہتی کہ ہم نے افغانستان کے دروازے کھول دیے ہیں۔ دنیا کے سب لوگ آئیں اور افغانستان کا چپا چپا چھان ماریں۔ وہ دیکھ لیں کہ ہمارے ہاں کوئی دہشت گردی کا کیمپ نہیں ہے۔ اس صورت میں امریکا کو اپنا مقدمہ ثابت کرنا پڑتا اور پھر آپ دیکھتے کہ امریکا اخلاقی لحاظ سے کس طرح پس پا ہو جاتا۔ اور اگر اس کے نتیجے میں اسامہ بن لادن کو غلط سزا ہوتی تو وہ خود اسلام کی عظمت کے لیے ایک بڑی قربانی بن جاتے اور ان کی شہادت مظلومانہ شہادت ہوتی، بالکل اسی طرح جس طرح سیدنا عثمان نے اپنی جان دے کر امت کو خون ریزی سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ اب تو جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اس میں ان کی استقامت پر رشک اور ان کی دانش پر ترس آتا ہے۔

سوال: آپ کی یہ باتیں بہت صحیح لگتی ہیں، مگر کیا کریں کہ ہمارے معاشرے میں انھیں بیان کرنا مشکل ہو گیا ہے؟

جواب: صحیح بات بیان کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔

سوال: لیکن کسی اسلامی سوسائٹی میں تو اپنی بات بیان کرنے پر کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے؟

جواب: ہماری سوسائٹی کی تربیت، بدقسمتی سے اسلامی اخلاقیات کی بنیاد پر نہیں ہوئی، اس میں تو آپ لوگوں کو مذہبی اختلافات کی بنا پر قتل کر رہے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قربان انجم/ جاوید احمد غامدی

''ندائے ملت'' کے استفسارات

حادثۂ نیویارک کے تناظر میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سوال: ۱۱ستمبر کے واقعات سے پوری دنیا، بالخصوص امریکا اور پاکستان تاریخ کے سنگین چیلنج سے دوچار ہیں۔ کتاب وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ دنیا کو ہول ناک تباہی سے بچانے کے لیے عالم اسلام، بالخصوص پاکستان کو کیا کردار اپنانا چاہیے؟

جواب: دہشت گردی کے خلاف اس عالمی جنگ میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہو جانا چاہیے اور جو لوگ اس جنگ کی قیادت کر رہے ہیں، انھیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ حق وانصاف کا دامن کسی حال میں اپنے ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیں۔

سوال: اس ضمن میں حکومت پاکستان نے اب تک جو طرزِ فکر وعمل اپنایا ہے، اس پر آپ کیا تبصرہ فرمائیں گے؟

جواب: اب تک جو اقدامات حکومت پاکستان نے کیے ہیں، انھیں میں حکمت و دانش پر مبنی اور اخلاقی لحاظ سے بالکل درست سمجھتا ہوں۔ اس سے ان غلطیوں کے بھی کسی حد تک ازالے کی توقع ہے جو افغانستان کے معاملے میں اس سے پہلے ہماری حکومت کرتی رہی ہے۔

سوال: بحرانوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عوام اور حکومت میں کامل ہم آہنگی کی اہمیت مسلمہ ہے۔ مگر اس ہم آہنگی کی اولین ضرورت یہ ہے کہ حکومت کس حد تک عوام کی نمائندہ حکومت ہے۔ ہماری حکومت کی از روئے کتاب و سنت Legitimacy اور Validity پر آپ کیا فرمائیں گے؟

جواب: اس وقت کی حکومت اسلامی شریعت اور دستورِ پاکستان، دونوں کی خلاف ورزی کر کے قائم ہوئی ہے، اس لیے اسے کوئی جائز حکومت تو قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن یہ موقع اس بحث کو چھیڑنے کا نہیں ہے۔ بالفعل حکومت اب یہی ہے۔ صورتِ حال کی نزاکت کے پیش نظر پوری قوم کو یک سوئی کے ساتھ ان حالات میں حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہییں تاکہ وہ درپیش چیلنج کا مقابلہ کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کرے۔

سوال: اسی طرح طالبان کی حکومت پر بھی تبصرہ فرمائیے؟

جواب: طالبان کی حکومت کی حیثیت بھی یہی ہے۔ اسے افغان عوام کی نمائندہ حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سوال: جہاد کی آپ کے نزدیک اجمالاً کیا تعریف ہے۔ اللہ کے رسولوں کی یہ سنت ہے کہ انھوں نے اقتدار کے بغیر جنگ اور قتال نہیں کیا (جسے ان دنوں جہاد کہا جاتا ہے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے مکالمہ جاری رکھا، ہتھیار نہیں اٹھائے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اقتدار حاصل ہونے اور اس کا استحکام یقینی بنانے تک کبھی جنگ نہیں کی۔ تیاری مکمل ہونے تک قرآن میں آپ صلی اللہ علیہ سلم کو 'ہاتھ روکے رکھنے کا حکم' دیا گیا (کفوا ایدیکم) ان نصوص کی بنا پر مقلدین اور غیر مقلدین میں اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ قتال یا جنگ اور اقامت حدود کے لیے اقتدار و حکومت کا وجود شرط ہے۔ پاکستان کی جہادی تنظیموں کو آپ اس حوالے سے اجماع اور روایت سے منحرف نہیں سمجھتے اور ان کی کامیابی کی کس حد تک توقع رکھی جا سکتی ہے؟

جو گروہ کشمیر کی مظلوم عورتوں، مردوں، بچوں کو بھارتی فوج کے مقابلے میں تحفظ فراہم نہیں کر سکتے، کیا انھیں مسلح کارروائیوں کا حق کسی قانونی اور اخلاقی ضابطے کے تحت حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا یہ گروہ افغانستان پر امریکی حملہ کے دفاع میں کارروائیاں کرنے کے از خود مجاز ہیں یعنی کسی حکومت کے احکام وضوابط سے ماوراء اقدام کر سکتے ہیں؟

جواب: جہاد کے معنی کسی جدوجہد میں پوری قوت صرف کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ تعبیر جس طرح اللہ کی راہ میں عام جدوجہد کے لیے استعمال ہوتی ہے، اسی طرح قتال فی سبیل اللہ کے لیے بھی جگہ جگہ آئی ہے۔ اس دوسرے مفہوم میں یہ قرآن کی رو سے صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے:

ایک، ظلم وعدوان کے خلاف،

دوسرے، اتمامِ حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف۔

پہلی صورت شریعت کا ابدی حکم ہے اور اس لیے کیا جاتا ہے کہ جب کسی قوم کی سرکشی اور شوریدہ سری اس حد کو پہنچ جائے کہ اسے نصیحت اور تلقین سے صحیح راستے پر لانا ممکن نہ رہے تو انسان کا حق ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے اور اس وقت تک اٹھائے رکھے، جب تک امن اور آزادی کی فضا دنیا میں بحال نہ ہو جائے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تلوار اٹھانے کی یہ اجازت اگر نہ دی جاتی تو قوموں کی سرکشی اس انتہا کو پہنچ جاتی کہ تمدن کی بربادی کا تو کیا ذکر معبد تک ویران کر دیے جاتے اور ان جگہوں پر خاک اڑتی جہاں اب شب و روز اللہ پروردگارِ عالم کا نام لیا جاتا اور اس کی عبادت کی جاتی ہے:

''اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجے، معبد اور مسجدیں، جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، سب ڈھا دیے جاتے۔'' (الحج ۲۲: ۴۰)

رہی دوسری صورت تو اس کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمام حجت سے ہے۔ جہاد کی یہ صورت

صحابۂ کرام کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔

قتال جس صورت میں بھی ہو، اس کے لیے اقتدار ایک لازمی شرط ہے۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں حکومت کے بغیر قتال کی ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس بات پر سلف و خلف میں ہمیشہ علما کا اجماع رہا ہے۔ مسلمانوں میں بعض افراد اور جماعتیں اس وقت جو کچھ کر رہی ہیں، وہ اسلامی شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''میزان'' میں ''قانونِ جہاد'' کے زیرِ عنوان اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اسے دیکھ سکتے ہیں۔

سوال: کیا جہاد کے لیے باقاعدہ اعلان ضروری ہے یا نہیں؟ نیز اسلام کی رو سے اعلان کی مجاز اتھارٹی کیا ہے؟

جواب: جہاد کے لیے باقاعدہ اعلان ضروری ہے، اسلامی شریعت کی رو سے یہ اعلان صرف حکومت ہی کر سکتی ہے۔

سوال: ہمارے اکابر کتاب و سنت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے (الا ماشاء اللہ)، مگر سیاسی ضروریات کے لیے کتاب و سنت اور تاریخ اسلامی کے حوالوں کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس پیش کش کا انداز بسا اوقات مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتا ہے۔ چند روز پیشتر جنرل پرویز مشرف کے مصاحب و مشیر حضرات نے صلح حدیبیہ کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی ٹیلی کاسٹ کرا دیا۔ یہ نہ سوچا کہ صلح حدیبیہ کے حوالے سے درپیش صورت حال میں بیعت رضوان زیادہ متعلق ہے۔ کیا ان اکابر کو دین اسلام میں فرائض، واجبات، مستحبات وغیرہ کی مسلسل وعظ و تلقین اور اس سے بھی بڑھ کر ان پر عمل درآمد کا احساس و ادراک یاد دلانا زیادہ ضروری نہیں؟

جواب: یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس زمانے کے مسلمان قرآن و سنت کی پیروی کرنے کے بجائے ہمیشہ انھیں اپنے دنیوی اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ علما اور سیاست دان اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ اس پر اس کے سوا کیا عرض کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت کی توفیق عطا فرمائے۔

سوال: آپ درپیش حالات میں دعوت اور جہاد میں سے اولین ترجیح کسے دیں گے؟

جواب: امتِ مسلمہ اس وقت کسی جہاد کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اپنی پوری قوت ان حالات میں ہمیں علم و اخلاق میں اعلیٰ مراتب کے حصول اور دین کی دعوت پر صرف کرنی چاہیے۔

سوال: دعوت و تبلیغ اور نفاذ دین کے لیے تحریک کو اغراض و مفادات پر مبنی سیاسی مصالح سے پاک و مبرا رکھنے کے لیے آپ کیا تجاویز پیش کریں گے؟

جواب: دین کے نفاذ کے لیے اگر دعوت اور صرف دعوت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کی جدوجہد آپ سے آپ اغراض و مفادات سے پاک ہو جائے گی۔

(بشکریہ ہفت روزہ ندائے ملت)

بیاض

—— جاوید

خیال و خامہ

(۲)

گزشتہ سے پیوستہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسی لو کی صدیوں رہی ہم سفر
وہ امت کہ تھی کاروانِ سحر

وہی جس سے دنیا میں نورِ حیات
وہی جس سے پیدا سرورِ حیات

وہ دی جس نے اقوام کو روشنی
تمدن دیا اُن کو ، تہذیب دی

خداوند عالم پہ ایماں دیا
خداؤں کو رخصت کا فرماں دیا

کیا اُن کو توحید میں گرم جوش
ہر آئینہ حق کے لیے سرفروش

وہ مے دی کہ جام و سبو اور تھے
وہ لے دی کہ ساز و گلو اور تھے

شرر تھا تو روحِ شرر بخش دی
سحر کو اذانِ سحر بخش دی

انھیں اپنا سوزِ دروں بھی دیا
خرد دی ، کمالِ جنوں بھی دیا

دیا اُن کو علم و ہنر کا شعور
حقیقت کے نفع و ضرر کا شعور

ہر آشفتہ خاطر کو دل کا حضور
ہر آزردۂ ناں کو فقر غیور

نگاہوں کو پاکیزگی کا جمال — وہ حسن طبیعت ، وہ حسن خیال

ہوئی جس سے تطہیر روح و بدن — مسلماں ہوئے علم و تہذیب و فن

اسے آج دیکھیں تو لگتا ہے خواب — کہ ہیں باغ صحرا تو دریا سراب

تلاطم ، نہ گوہر ، نہ موجِ ہوا — نہ پھولوں کی نکہت ، نہ حسن ادا

یہ امت ہے اب عہد رفتہ کی یاد — سر شام صبح گزشتہ کی یاد

ہے باقی اگر کچھ تو باقی ہے نام

زمیں اس کے جلووں سے فارغ تمام

(باقی)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org